Shivaji University, Kolhapur

Centre for Distance Education

اسرارِ ادب

ASRAR-E-ADAB

اُردو (لازمی)

URDU (COMPULSORY)

بی۔اے۔سال اوّل

B.A.FIRST YEAR

میقات اول

SEMESTER FIRST

Edited By

Dr.Sajid Ali Qadri

(H.o.D Urdu S.P.D.M. College, Shirpur. Dist: Dhule

مرتب

ڈاکٹر ساجد علی قادری

(صدر شعبۂ اردو ایس۔پی۔ڈی۔ایم۔کالج، شیر پور ضلع دھولیہ)

w.e.f. 2018-2019

مقاصدِ نصاب

۱) B.A. اردو زبان کے ذریعے کسی بھی فیلڈ میں Translation کر کے Job حاصل کرنا۔

۲) ایک کامیاب ترجمہ نگار تیار کرنا۔

۳) مثالی اور کامیاب ترجمہ نگاروں کا علم حاصل کرنا۔

۴) ہندوستانی اور بین الاقوامی ادب کا مطالعہ اور ترجمہ کرنا۔

۵) نظم نگاری۔مرثیہ ، مثنوی ، غزل وغیرہ کے اصناف کا مطالعہ کر کے شاعری کو سمجھنا۔

۶) نظم نگاری کا تعارف کرانا اور نظم کی مختلف اقسام سے واقفیت حاصل کرانا۔

۷) اخبار ، ٹی۔وی۔ ریڈیو ،انٹرنیٹ کے ذریعے عوام تک اردو زبان کو فروغ دینا اور زرائے معاش کے مواقع فراہم کرانا۔

۸) عملی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرانا۔

۹) ڈرامہ، ناول، افسانہ، داستان کے ذریعے طلبہ میں Acting، انسانی زندگی کے حقیقی کردار کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرانا۔

۱۰) طویل نظم کے ذریعے سے دنیا میں جنگ اور امن و امان کے مسائل کو جاننا۔

وائس چانسلر

شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور

فہرست

اکائی		صفحہ نمبر
اکائی۔۱	گزرا ہوا زمانہ (سرسید احمد خان)	05
اکائی۔۲	روشنی (منشی پریم چند)	15
اکائی۔۳	مرید پور کا پیر (پطرس بخاری)	25
اکائی۔۴	گدڑی کا لال۔نوُر خاں (خاکہ) مولوی عبدالحق	38
اکائی۔۵	زیر لب (صفیہ کے خطوط اختر کے نام) صفیہ اختر	51
اکائی۔۶	زبان گویا۔مولانا الطاف حسین حالی	58
اکائی۔۷	خدا پرست شہزادی۔میر امن	66

اکائی 1۔گزرا ہوا زمانہ

سر سید احمد خاں

اکائی کے اجزاء

1.1 مصنف کا تعارف

1.2 متن ''گزرا ہوا زمانہ''

1.3 خلاصہ ''گزرا ہوا زمانہ''

1.1 مصنف کا تعارف:

سید احمد بن متقی خان (پیدائش،7اکتوبر 1817ء دہلی–انتقال،27مارچ 1898ء علی گڑھ)المعروف سر سید۔انیسویں صدی کا ایک ہندوستانی مسلم نظریاتی عملیت کا حامل مصلح اور فلسفی تھے۔سر سید احمد خان ایک نبیل گھرانے میں پیدا ہوا جس کے مغل دربار کے ساتھ مضبوط تعلقات تھے۔سر سید نے قرآن اور سائنس کی تعلیم دربار میں ہی حاصل کی، جس کے بعد یونیورسٹی آف ایڈنبرا نے انہیں قانون میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ 1838ء میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کی اور 1867ء وہ چھوٹے مقدمات کے لیے جج مقرر کیا گے۔1876ء میں وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔1857ء کی جنگ آزادی کے دوران میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وفادار رہے اور یورپیوں کی جانیں بچانے میں ان کے کردار کی سلطنت برطانیہ کیطرف سے ستائش کی گئی۔

بغاوت ختم ہونے کے بعد انہوں نے اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کیا۔اس رسالہ کا فائدہ سلطنت برطانیہ کو ہوا جس نے اس کی بنیاد پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے برصغیر کا تمام قبضہ لے لیا اور ہندوستان کے تمام معاملات براہ راست اپنے قبضہ میں لے لیے۔مسلمانوں کے راسخ الاعتقاد طرز کو ان کے مستقبل کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے سر سید نے مغربی طرز کی سائنسی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جدید اسکولوں اور جرائد کا اجرا کیا اپنے کلامی مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جو معتزلہ کے افکار کا چربہ تھا مگر اس کے کلامی نظریات مقبول نہ ہو سکے اس لیے صرف سائنسی علوم کی اشاعت تک محدود رہا۔

1859ء میں سر سید نے مرادآباد میں گلشن اسکول، 1863ء میں غازی پور میں وکٹوریہ اسکول اور 1864ء میں سائنسی سوسائٹی برائے مسلمانان قائم کی۔ 1875ء میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج جو جنوبی ایشیا میں پہلی مسلم یونیورسٹی بنا۔ اپنے کردار کے دوران سر سید نے بار بار مسلمانوں کو سلطنت برطانیہ سے وفاداری پر زور دیا اور تمام ہندوستانی مسلمانوں کو اردو کو بطور زبانِ رابطِ عامہ اپنانے کی کوشش کی۔ اس طرح برصغیر کے مسلمان معاشرہ میں فارسی اور عربی کے زوال کا قائد بن گیا اور مسلمانوں کے ہزار سالہ علمی مواد سے ان کا تعلق منقطع کرنے کا سبب بھی یہی ہوا۔ وہ اپنی برطانوی وفاداریوں کے سبب انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے گہری تنقید کا نشانہ بنے۔ سر سید کو پاکستان اور بھارتی مسلمانوں میں ایک موثر شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور اکثر دو قومی نظریہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے جو تاریخی بد دیانتی پر مبنی ہے دو قومی نظریہ کے اصل بانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ہیں۔ اس کا سہرا سر سید کے سر منڈھ دینا تاریخی بد دیانتی ہے البتہ دو قومی نظریہ ہی وہ نظریہ ہے جو آگے چل کر تحریک پاکستان کی نظریاتی بنیاد بنا۔ اس نے دیگر مسلم رہنماؤں بشمول علامہ محمد اقبال اور محمد علی جناح کو بھی متاثر کیا جس کا کوئی ٹھوس علمی ثبوت موجود نہیں ہے بلکہ اثر اور متاثر کی اتنی نسبت ہے جتنی کہ سکندر اعظم اور نپولین میں موجود ہو سکتی ہے۔ سر سید کی اسلام کو سائنس اور جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لیے عقلیت پسند (معتزلہ) روایت کی وکالت نے عالمی طور پر اسلامی اصلاح پسندی کو متاثر کیا اور نا قابل تلافی نقصان دیا۔

ابتدائی زندگی:

آباؤ اجداد شاہ جہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے۔ دستور زمانہ کے مطابق عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد خان سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم میں آپ نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا اور عربی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے حساب، طب اور تاریخ میں بھی مہارت حاصل کی۔ جریدے القرآن اکبر کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں ان کے بڑے بھائی نے شہر کے سب سے پہلے پرنٹنگ پریس کی بنیاد رکھی۔ ورژن کی ضرورت سر سید نے کئی سال کے لیے ادویات کا مطالعہ کی پیروی کی لیکن اس نے کورس مکمل نہیں ہے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ سے عدالتی کام سیکھا۔ 1837ء میں

آگرہ میں کمیشنر کے دفتر میں بطور نائب منشی کے فرائض سنبھالے۔ 1841ء اور 1842ء میں مین پوری اور 1842ء اور 1846ء تک فتح پور سیکری میں سرکاری خدمات سرانجام دیں۔ محنت اور ایمانداری سے ترقی کرتے ہوئے 1846ء میں دہلی میں صدر امین مقرر ہوئے۔ دہلی میں قیام کے دوران میں آپ نے اپنی مشہور کتاب ''آثارالصنادید'' 1847ء میں لکھی۔ 1857ء میں آپ کا تبادلہ ضلع بجنور ہو گیا۔ ضلع بجنور میں قیام کے دوران میں آپ نے اپنی کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' لکھی۔ جنگ آزادی ہند 1857ء کے دوران میں آپ بجنور میں قیام پزیر تھے۔ اس کٹھن وقت میں آپ نے بہت سے انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں۔ آپ نے یہ کام انسانی ہمدردی کے لیے ادا کیا۔ جنگ آزادی ہند 1857ء کے بعد آپ کو آپ کی خدمات کے عوض انعام دینے کے لیے ایک جاگیر کی پیشکش ہوئی جسے آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

1857ء میں آپ کو ترقی دے کر صدر الصدور بنا دیا گیا اور آپ کی تعیناتی مراد آباد کر دی گئی۔ 1862ء میں آپ کا تبادلہ غازی پور ہو گیا اور 1867ء میں آپ بنارس میں تعینات ہوئے۔ 1877ء میں آپ کو امپریل کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔ 1888ء میں آپ کو سر کا خطاب دیا گیا اور 1889ء میں انگلستان کی یونیورسٹی اڈنبرا نے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1864ء میں غازی پور میں سائنسی سوسائٹی قائم کی۔ علی گڑھ گئے تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا۔ انگلستان سے واپسی پر 1870ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اس میں مضامین سرسید نے مسلمانان ہند کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور ادب میں علی گڑھ تحریک کی بنیاد پڑی۔ سرسید کا کارنامہ علی گڑھ کالج ہے۔ 1887ء میں ستر سال کی عمر میں پینشن لے لی اور اپنے کالج کی ترقی اور ملکی مفاد کے لیے وقف کر دیا۔

1859ء میں وہ اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ انگلستان گیے تو وہاں انھیں دو مشہور رسالوں (Tatler) اور (Spectatorr) کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ دونوں رسالے اخلاق اور مزاح کے خوبصورت امتزاج سے اصلاح معاشرہ کے علم بردار تھے۔ آپ نے مسلمانوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ظرافت اور خوش طبعی فطری طور پر شخصیت کا حصہ تھی۔ سرسید احمد خاں برصغیر میں مسلم نشاتِ ثانیہ کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ انیسویں صدی کے بہت بڑے مصلح اور رہبر تھے۔ انہوں نے

ہندوستانی مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور انھیں باعزت قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی آپ ایک زبردست مفکر، بلند خیال مصنف اور جلیل القدر مصلح تھے۔''سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز اُن کے خون کے پیاسے ہورہے تھے۔ وہ توپوں سے اڑائے جاتے تھے، سولی پر لٹکائے جاتے تھے، کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ اُن کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔ اُنکی جائدادیں ضبط کرلیں گئیں تھیں۔ نوکریوں کے دروازے اُن پر بند تھے اور معاش کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اصلاح احوال کی اگر جلد کوشش نہیں کی گئی تو مسلمان'' سائیس، خانساماں، خدمتگار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا کچھ اور نہ رہیں گے۔

سرسید نے محسوس کرلیا تھا کہ اونچے اور درمیانہ طبقوں کے تباہ حال مسلمان جب تک باپ دادا کے کارناموں پر شیخی بگھارتے رہیں گے اور انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہیں گے اُس وقت تک وہ بدستور ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے۔ اُنکو کامل یقین تھا کہ مسلمانوں کی ان ذہنی اور سماجی بیماریوں کا واحد علاج انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ تمام عمر جدوجُہد کرتے رہے۔''جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے۔۔۔ مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں (سرسید احمد) سرسید کا نقطۂ نظر تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہی ہموار کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اوار دوسری اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں۔ انہوں نے محض مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کے لیے جدید علوم کے حصول کی سہولتیں بھی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے سائنس ؟ جدید ادب اور معاشرتی علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا۔ انہوں نے انگریزی کی تعلیم کو مسلمانوں کی کامیابی کے لیے زینہ قرار دیا تاکہ وہ ہندوؤں کے مساوی ومعاشرتی درجہ حاصل کرسکیں۔ 1859ء میں سرسید نے مرادآباد اور 1862ء میں غازی پور میں مدرسے قائم کیے۔ ان مدرسوں میں فارسی کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید علوم پڑھانے کا بندوبست بھی کیا گیا۔

(1875ء میں انہوں نے علی گڑھ میں ایم اے او ہائی اسکول کی بنیاد رکھی جو بعدازاں ایم۔اے۔او کالج

اورآپ کی وفات کے بعد 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ اختیار کرگیا۔ان اداروں میں انہوں نے آرچ بولڈ آرنلڈ اورموریسن جیسے انگریز اساتذہ کی خدمات حاصل کیں)۔

1863ء میں غازی پور میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔اس ادارے کے قیام کا مقصد مغربی زبانوں میں لکھی گئیں کتب کے اردو تراجم کرانا تھا۔بعدازاں 1876ء میں سوسائٹی کے دفاتر علی گڑھ میں منتقل کردیے گئے۔سرسید نے نئ نسل کوانگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ جدید مغربی علوم سے بہرہ ور ہوسکے۔یوں دیکھتے ہی دیکھتے مغربی ادب سائنس اور دیگر علوم کا بہت سا سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہوگیا۔سوسائٹی کی خدمات کی بدولت اردوزبان کو بہت ترقی نصیب ہوء۔

1886ء میں سرسید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔مسلم قوم کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے افراد کی فراہمی میں اس ادارے نے بڑی مدد دی اور کانفرنس کی کارکردگی سے متاثر ہوکر مختلف شخصیات نے اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔لاہور میں اسلامیہ کالج کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام، پشاور میں اسلامیہ کالج اور کانپور میں حلیم کالج کی بنیاد رکھی۔محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کے سیاسی ثقافتی معاشی اور معاشرت حقوق کے تحفظ کے لیے بھی کوشاں رہی۔ترمیم بمقام بنارس ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان'' منعقد ہوگئی جس کے سیکرٹری سرسید قرار پائے۔اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں تک ہوسکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اوراسکولوں میں مسلمان طالبِ علم کس لیے کم پڑھتے ہیں،علومِ قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علومِ جدیدہ ان میں کیوں نہیں رواج پاتے اور جب یہ موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہوجائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اوران تدبیروں پرعمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔

مدرسہ کے لیے انہوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے۔ہزار ہا روپیہ ان سفروں میں ان کا صرف ہوا۔اگرچہ ان کے دوست اور رفیق بھی، جوان کے ہمراہ جاتے تھے، اپنا اپنا خرچ اپنی گرہ سے اُٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سرسید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا۔اس کے سوا ہمیشہ ریزروڈ گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں اُن کی کمی زیادہ تر سرسید کو پوری کرنی پڑتی تھی۔ایک باراُن کے ایک دوست نے اُن سے کہا

کہ آپ راجپوتانہ کا بھی ایک باردورہ کیجئے۔‘‘ سرسید احمد خان نے 1875ء میں ’’محمڈن اینگلواورینٹل کالج‘‘ کی داغ بیل ڈالی جسے 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ ملا اور آج اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے۔ انہوں نے کہا، میں ہندوستانیوں کی ایسی تعلیم چاہتا ہوں کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے حقوق حاصل ہونے کی قدرت ہو جائے، اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک نہیں دیے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلا دے گی۔

1.2 متن۔ ’’گزرا ہوا زمانہ‘‘

برس کی آخیر رات کو ایک بڈھا اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کڑک اور آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی آخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانہ کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جبکہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپے اشرفی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں باپ بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا، ’’ہائے وقت ہائے، وقت ہائے گزرے ہوئے زمانے۔ افسوس کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا۔‘‘

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ، سڈول ڈیل، بھرا بھرا بدن رسیلی آنکھیں، موتی کی لڑی سے دانت، امنگ میں بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی اور خدا پرستی کی بات بتاتے تھے اور یہ کہتا تھا

کہ ’’آہ ابھی بہت وقت ہے۔‘‘ اور بڑھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لئے تیار رہتا۔ آہ وقت گزر گیا۔ آہ وقت گزر گیا۔ اب پچتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے آپ اپنے تیئں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ’’ابھی وقت بہت ہے۔‘‘

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے، اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا ’’ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراو؟ نی ہے جیسی یہ رات۔‘‘ یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے یہ کہتی ہوئی کہ ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔ باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دانتوں میں انگلی دیئے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوو؟ ں کی لڑی جا ری ہے۔ دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقیے سے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا، دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا۔ اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ ’’ہائے وقت نکل گیا۔ ہائے وقت نکل گیا اب کیوں کر اس کا بدل ہو۔‘‘

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا لڑتا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے پر رات ویسا ہی اندھیری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور پھر اپنی جگہ آبیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑ پنا یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ وہ جوانی کا جوبن نہ وہ دل رہا تھا اور نہ

دل کے ولولوں کا جوش۔اس نے اپنی اس نیکی کے زمانہ کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوٰۃ دینی بھوکوں کو کھلانا، مسجدیں اور کنوئیں بنوانا یاد کر کے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔فقیروں اور درویشوں کی جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھنڈر ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔اس کا دل پھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ سوجھی۔اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا ’’ہائے وقت ہائے وقت میں نے تجھ کو کیوں کھو دیا۔‘‘

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے تارے نکل آئے ہیں۔ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکا یک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوبصورت دلہن نظر آئی۔اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آ گئی۔وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجہ سے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔وہ بولی کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔اس نے پوچھا کہ تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے۔وہ بولی، ہاں ہے۔نہایت آسان پر بہت مشکل۔جو کوئی خدا کے فرض اس بدوی کی طرح جس نے کہا ’’واللہ لا یزید ولا ینقص‘‘ ادا کر کے انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے۔اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔انسان ہی ایسی چیز ہے اخیر تک رہے گا۔پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل درنسل اخیر تک چلی آتی ہے۔نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے، انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے ساعی ہو۔ یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھراس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اورکم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔اس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔نیک کام جو کئے تھے ثواب کے لالچ اور گو یا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔خاص قومی بھلائی کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس دل فریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا۔اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آئندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بے قرار ہوکر چلا اٹھا''ہائے وقت ہائے وقت۔کیا پھر تجھے میں بلاسکتا ہوں۔ہائے میں دس ہزار دیناریں دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہوسکتا۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک آہ سرد بھری اور بے ہوش ہوگیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔اس کی پیاری ماں اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔اس کو گلے لگا کر اس کی بلائیں لی۔اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اس کے گرد آ کر کھڑے ہوئے۔ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس کے برس دن روتا ہے، کیوں تو بیقرار ہے۔کس لئے تیری ہچکی بندھ گئی ہے۔اٹھ منہ ہاتھ دھو، کپڑے پہن۔نوروز کی خوشی منا، تیرے بھائی بہن تیرے منتظر کھڑے ہیں۔تب وہ لڑکا جاگا اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڈھا ہوگیا تھا۔اس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔اس نے سن کر اس کو جواب دیا کہ بیٹا بس تو ایسا مت کر جیسا اس پشیمان بڈھے نے کیا بلکہ ایسا کر جیسا تیری دلہن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا اور نہایت خوشی سے پکارا کہ''او یہی میری زندگی کا پہلا دن ہے۔میں کبھی اس بڈھے کی طرح نہ پچتاروں گا اور ضرور اس دلہن کو بیاہوں گا جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھلایا اور ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔اور خدا او خدا تو میری مدد کر۔آمین۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو! اور اے میری قوم کے بچو!! اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کروتا کہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچتاؤ۔ہمارا زمانہ تو اخیر ہے اب خدا سے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔آمین۔(انتخاب مضامین سرسید، ص 67)

1.3 خلاصہ۔''گزرا ہوا زمانہ''

سرسید احمد خان نے سبق گزرا ہوا زمانہ کا تانہ بانہ اس مرکزی خیال کو واضح کرنے کے لئے بنایا ہے کہ دنیا میں خدمت

خلق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، تمام چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔صرف اور صرف انسان کے بھلائی ہی ایسی چیز ہے جو آخر دم تک قائم رہتی ہے۔بشرطیکہ اس میں کسی بھی قسم کا دکھاوا نہ ہو اور نہ ہی وہ اعمال غرض پر مبنی ہو

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
صدا عشق دوراں دکھاتا نہیں

ایک بچہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے رات بڑی ہوناک ہے۔بارہ بجلی کڑک رہی ہے اور وہ اپنے کمرے میں سہما ہوا بیٹھا ہے ور ماضی کی یادوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کیا ہوا ہے۔اسے اپنا بچپن یاد آتا ہے جب اسے کسی چیز کی فکر نہ تھی اور اسے اشرفی کے بدلے مٹھائی اچھی لگتی تھی اور وہ سارے گھر کا تارا تھا۔

پھر وہ جوانی کا زمانہ یاد کرتا ہے۔جب وہ حسن و جمال کے نگینوں سے آراستہ تھا۔سڈول جسم، موتی جیسے دانت اور اس پر سرخ وسفید رنگ میں بہت وجیہہ نظر آتا تھا۔ماں باپ خدا پرستی اور نیکی کی باتیں بتاتے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ ابھی بہت وقت ہے۔اسے بزرگوں کی نصیحتیں زہر لگتیں۔

پھر اسے اپنا ادھیڑ پن یاد آیا جس میں نہ ہی جوانی رہتی ہے نہ ولولے اور امنگیں۔طبیعت بدی کی نسبت نیکی کی طرف زیادہ مائل تھی وہ صوم وصلوۃ کا پابند ہو گیا تھا اور زکوۃ بھی پابندی سے ادا کرتا تھا۔

پھر وہ سوچتا ہے کہ اس کے تمام نیک اعمال صرف اس کی ذات تک محدود ہیں۔اس نے تمام کام اپنی مفاد پرستی کی خاطر کئے ہیں۔وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مطلع صاف ہو چکا ہے۔اسے آسمان کے بیچوں بیچ ایک دلہن نظر آئی۔اس نے بوڑھے سے کہا کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔اگر مجھ کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو انسانی بھلائی کے کام کرو۔یہ کہہ کر وہ غائب ہو گئی۔

دلہن کے جانے کے بعد وہ گزرے ہوئے زمانے پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے کہ اس نے پچپن سال کی عمر میں کوئی بھی انسانی بھلائی کا کام نہ کیا۔یہ سوچ کر وہ غمگین ہو جاتا ہے۔

آنکھ کھلنے پر وہ اپنی ماں کو خواب بتاتا ہے۔ماں بیٹے کو نصیحت کرتی ہے کہ اپنے قیمتی وقت کو بوڑھے کی طرح ضائع مت کرو ورنہ بعد تم پچھتاؤ گے۔صرف اپنے بھلے اور مفاد کی خاطر جینا کوئی جینا نہیں۔اصل نیکی قوم کی بھلائی کی خاطر جینے میں ہے۔

غرض سرسید نے قومی ہمدردی کے تصور کو تمثیلی مضمون کی شکل میں بڑے دل آویز اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے

اپنے لئے تو سبھی جیتے ہیں اس جہاں میں
ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا

اکائی 2 ۔ روشنی

منشی پریم چند

اکائی کے اجزاء

2.1 حیات (منشی پریم چند)

2.2 تصانیف

2.3 متن ''روشنی''

2.4 مزید مطالعہ کے لیے کتب

2.1 حیات:

منشی پریم چند ۳۱ر جولائی ۱۸۸۰ء میں کایستھوں کے سریواستوا گھرانے میں بنارس کے لمہی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ سوتیلی ماں کے سلوک نے ماں کی محرومی کا احساس دِلایا۔ اس احساس نے آگے چل کر ان کی شخصیت اور فکر وفن دونوں کو متاثر کیا۔ والد کے تبادلے کی وجہ سے وہ ۱۸۹۲ء میں جب گورکھپور پہنچے تو وہاں ان کا داخلہ مشن اسکول میں کرایا گیا۔ گورکھپور کے قیام کے دوران انہوں نے نہ صرف انگریزی ناول پڑھے بلکہ داستانیں اور رسوا، شرر اور سرشار، کے تقریباً تمام ناول پڑھ ڈالے اور فکشن کا تصور ان کے ذہن میں رچنے بسنے لگا۔ ابھی وہ نویں یا دسویں جماعت ہی میں تھے کہ ان کے سوتیلے نانا نے ان کے والد پر دباؤ ڈال کر بستی کے ایک زمین دار گھرانے کی لڑکی سے ان کی شادی کردی جس سے پریم چند کے تعلقات کبھی اچھے نہیں رہے۔

۱۸۹۷ء میں والد کے انتقال کے بعد پریم چند پر سوتیلی ماں کے علاوہ دو بھائیوں کی ذمہ داری آن پڑی۔ انہیں دِنوں پریم چند کے تعلقات رسالہ زمانہ کے مدیر منشی دیانرائن نگم سے ہوئے۔ ان کے رسالہ میں ان کے ابتدائی مضامین اور تبصرے شائع ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کا تبادلہ کانپور میں ہوگیا جس کی وجہ سے اس دوستی اور رفاقت میں مزید پختگی آئی۔ یہاں نگم کے علاوہ درگا سہائے سرور، نوبت رائے نظر، پیارے لال شاکر جیسے لوگوں سے بھی دوستی ہوئی۔

جلد ہی پہلی بیوی سے علیحدگی ہوگئی۔ ۱۹۰۶ء میں ضلع فتح پور کی شیورانی دیوی سے ان کی شادی ہوگئی۔

۱۹۱۶ء میں بڑے بیٹے شری پت رائے کی ولادت ہوئی۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی، تاریخ اور فارسی مضامین کے ساتھ سکنڈ ڈیویژن میں بی اے کیا۔ ۱۹۲۱ء میں امرت رائے کی پیدائش ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں فراق گورکھپوری کے ساتھ مل کر انہوں نے سرسوتی پریس قائم کیا جس نے ان کو زندگی بھر پریشانی میں ڈالے رکھا۔ اب وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں

میں لکھتے تھے لیکن زیادہ تر اُردو میں جو بعد میں ترجمہ ہوکر ہندی میں شائع ہوتا تھا، چند ہی تخلیقات ایسی ہیں جو براہِ راست ہندی میں لکھی گئی ہیں۔اس درمیان انہوں نے ہنس، مادھوری جیسے رسالے بھی نکالے جس سے پریم چند کو نقصان ہی ہوا۔۱۹۲۹ء میں انہیں حکومت کی طرف سے رائے صاحب کے خطاب سے نوازا گیا لیکن انہوں نے اس خطاب کو لینے سے انکار کردیا۔کچھ دنوں کے لیے وہ بمبئی بھی گئے جہاں ان کے ناول بازارِحسن پر فلم بھی بنی جو ناکام رہی اور پریم چند مایوس ہوکر واپس آ گئے۔۱۰/اپریل ۱۹۳۶ء کو انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارت کی اور معرکہ کا خطبہ پیش کیا۔لکھنؤ سے لاہور گئے۔طبیعت خراب ہوتی گئی لاہور سے واپس آنے کے بعد بستر پر پڑ گئے اور ۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

خودکو جانچنے کا سوال:

1. پریم چند کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. پریم چند کے والد کا کیا نام تھا؟
3. ان کے احباب میں دو کے نام بتائیے؟
4. پریم چند کا انتقال کب ہوا؟

2.2 تصانیف:

پریم چند نے صرف چھپن سال کی عمر پائی، ان کی ادبی وتخلیقی عمر اس سے بھی کم ہے۔لیکن اس کے باوجود انہوں نے بے پناہ لکھا اور خوب لکھا۔افسانوں اور ناولوں کے علاوہ مضامین، تبصرے، اداریے خطوط اور بھی بہت کچھ۔پریم چند نے ۱۹۰۳ء میں اپنا پہلا ناول اسرارِ معابد نواب رائے کے نام سے لکھنا شروع کیا جو بنارس کے ہفتہ وار اخبار ''آوازۂ خلق'' میں قسط وار شائع ہوا۔۱۹۰۸ء میں ان کا پہلا افسانہ عشقِ دنیا اور حب وطن ''زمانہ'' میں شائع ہوا۔اسی سال ان کا پہلا افسانوی مجموعہ سوزِ وطن شائع ہوا جس میں پانچ افسانے تھے۔پریم چند کے نام سے ان کی پہلی کہانی ''بڑے گھر کی بیٹی'' دسمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔۱۹۱۲ء میں ان کا ناول جلوۂ ایثار شائع ہوا، اور ۱۹۱۵ء میں دوسرا افسانوی مجموعہ پریم پچیسی شائع ہوا۔۱۹۳۶ء میں انہوں نے اپنا آخری ناول منگل سوتر لکھنا شروع کیا اور گئودان کو برائے اشاعت پریس میں دیا۔ذیل میں ان کے افسانوی مجموعوں کے نام اور سنین اشاعت دیے جارہے ہیں۔

۱)	سوزِ وطن	۱۹۰۸ء
۲)	پریم پچیسی (اول)	۱۹۱۵ء
۳)	پریم پچیسی (دوم)	۱۹۱۸ء
۴)	پریم بتیسی (اول)	۱۹۲۰ء
۵)	پریم بتیسی (دوم)	۱۹۲۰ء
۶)	خاکِ پروانہ	۱۹۲۸ء

۷) خواب وخیال ۱۹۲۸ء

۸) فردوس خیال ۱۹۲۹ء

۹) پریم چالیسی (اول) ۱۹۳۰ء

۱۰) پریم چالیسی (دوم) ۱۹۳۰ء

۱۱) آخری تحفہ ۱۹۳۴ء

۱۲) زادِراہ ۱۹۳۶ء

۱۳) دودھ کی قیمت ۱۹۳۷ء

۱۴) واردات ۱۹۳۸ء

2.3 متن۔ ''روشنی''

آئی. سی. ایس۔ پاس کر کے ہندوستان آیا تو مجھے مما لک متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی۔ میری دلی مراد برآئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے ہی پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی۔ اسلیے سیر و شکار اور اخبارات ورسائل سے کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یوروپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے۔! سوچتا تھا وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے ہی شان دار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا۔ پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور لندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی مگر ناخوش گوار نہیں۔ ہوا میں بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں پر بور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا۔ کیوں کہ ان دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا۔ چلو بیٹا چلو۔ ڈھائی گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے اور ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیے گئے تھے۔

جا بجا کاشت کار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چلی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے

لیے زمین تیار کی جارہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل، وہی افسوس ناک جہالت، وہی شرمناک نیم برہنگی، اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائرکٹر، انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح، کوئی تغیر نہیں۔ تعلیم کا طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک غلبہ کر لیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں۔ مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا۔ لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل۔ آج تو مغرب دنیا کا مشعل ہدایت ہے۔ ننھا سا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی ہے۔ اپنی صنعت وحرفت کی بدولت بے شک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے، اس کا مستقبل تاریک ہے۔ جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ آج بھی شجر و حجر کی عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔ اس کی اگر یہ حالت ہے تو تعجب کا کوئی مقام نہیں۔ میں انہیں تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔ مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا۔ افق گرد و غبار کے پردے میں چھپ گیا تھا، آندھی کی علامت تھی۔ میں نے گھوڑے کو تیز کیا لیکن لمحہ بہ لمحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکہ وتنہا طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا تیز ہوگئی۔ وہ پردہ غبار سر پر آ پہنچا اور دفعتاً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ہوا اتنی تند تھی کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ، اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الاماں۔ گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سوجتا تھا یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اف ایک قیامت تھی جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ سنگریزے گرد کے ساتھ اڑ کر منہ پر اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلط

ہوگئی۔ کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آجاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں۔ کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔طوفان میں ہی بڑے بڑے تو دے بھی تو ٹوٹ جاتے ہیں کوئی ایسا تو دہ لڑھکتا ہوا آجائے تو بس خاتمہ ہے۔ ہلنے کی بھی تو گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سوجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم داہنے بائیں ہو جاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آ کر صفایا کر دے گا۔ دل پر بے اختیار رقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتا نہ چلے۔ افوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتاً جھن جھن کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ اس اراراہٹ میں بھی جھن جھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سانڈنی دوڑی آرہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہوگا ہی مگر اسے راستہ کیوں سوجھ رہا ہے۔ کہیں سانڈنی ایک قدم بھی ادھر ادھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائیں۔ کوئی زمین دار ہوگا مجھے دیکھ کر شاید پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے مگر ہے بلا کا ہمت والا۔

ایک لمحے میں جھن جھن کی آواز قریب آ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جارہی ہے۔ نہ آندھی کا خوف ہے نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ نہ چٹانوں کے گرنے کا غم۔ گویا یہ بھی کوئی روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور اس سے بولا، ''او عورت! گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں مگر آواز دس گز نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

میں نے چیخ کر پکارا، ''او عورت! ذرا ٹھہر جا۔ گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''

عورت رک گئی۔ اس نے میرے قریب آ کر، مجھے دیکھ کر، ذرا سر جھکا کر کہا، ''کہاں جاؤ گے؟''

''گجن پور کتنی دور ہے؟''

''چلے آؤ۔ آگے ہمارا گاؤں ہے اس کے بعد گجن پور ہے۔''

''تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟''

''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے۔''

''تم اس آندھی میں کہیں رک کیوں نہیں گئیں؟''

''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں۔ کیسے رک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔'' آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔ گرد وغبار کی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی۔ اس عورت کا کیا حشر ہوا مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفے نے کہا اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا، دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم۔ موت تو اسے باعث نجات ہوگی۔ میری حالت اور ہے۔ زندگی اپنی تمام دلفریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔ حوصلے ہیں، ارادے ہیں۔ میں اسے کیوں کر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔ میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالوں میں سر چھپا لیتا ہے۔

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔ اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہو گیا۔ نہ گرد وغبار کا نشان تھا نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آ گئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔ سامنے ایک پہاڑی تھی اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا موضع تا۔۔ میں جوں ہی اس گاؤں میں پہنچا۔ وہی عورت ایک بچے کو گود میں لیے میری طرف آ رہی تھی مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم رستہ نہ بھول گئے ہو۔ تمہیں ڈھونڈنے جا رہی تھی۔''

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا۔ ''میں اس کے لیے تمہارا بہت ممنون ہوں۔ آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے رستہ نہ سوجھا۔ میں وہیں کھڑا ہو گیا۔ یہی تمہارا گاؤں ہے؟ یہاں سے جگن پور کتنی دور ہوگا؟''

بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے کہیں داہنے بائیں مڑیو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔''

''یہی تمہارا بچہ ہے۔''

''نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھونپڑیا کہیں اڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے تو پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ بڑا شیطان

ہے۔لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔کہیں جاتی ہوں من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔''

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں ہے، لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث انداز گفتگو، اس کی سادگی اور جذب؟ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہوگئی۔پوچھا، ''تمہیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہو گئے۔''

عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی:

''ابھی تو کل چھے مہینے ہوئے ہیں بابو جی۔بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا۔بس بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے، ایک لوٹا پانی پیا، قے ہوئی۔بس آنکھیں بند ہوگئیں۔نہ کچھ کہا نہ سنا۔میں سمجھی تھکے ہیں، سو رہے ہیں۔جب کھانا کھانے کو اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔تب سے بابو جی! گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں۔کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔بیل بدھیے بیچ کر انہیں کے کریا کرم میں لگا دیے۔بھگوان تمہارے ان دونوں گلاموں کو جلا دے میرے لیے یہی بہت ہیں۔''

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آب دیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''میری طرف سے یہ بچوں کے مٹھائی کھانے کے لیے لے لو، مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔

ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی، ''نہیں بابو جی، یہ رہنے دیجیے۔میں غریب ہوں، لیکن بھکارن نہیں ہوں۔''

''یہ بھیک نہیں ہے بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہے۔''

''نہیں بابو جی۔''

''مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔''

''نہیں بابو جی۔جس سے بیاہ ہوا اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔بھگوان تمہارا بھلا کریں۔اب چلے جاؤ۔نہیں دیر ہو جائے گی۔''

میں دل میں خفیف اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ جنھیں میں جاہل، کور باطن، بے خبر سمجھتا تھا اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری، یہ فرض شناسی، یہ توکل! اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیب نفس ہے اور محض اعلاڈ گریاں نہیں، تو یہ عورت تعلیم کی معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔

میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''تمھیں اس آندھی میں ذرا سا ڈر نہ معلوم ہوتا تھا؟''

عورت مسکرائی۔ ''ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں تو کیا یہاں نہیں مار سکتے؟ میرا آدمی تو گھر آ کر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گجن پورا کیلے نہ جاتے۔ جا کر تمھیں پہنچا آتا۔ تھوڑی خدمت کرتا۔''

گھوڑا اڑا۔ میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اڑ رہا تھا جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پا کر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے دفتروں سے بھی نہ حاصل ہوئی تھی۔ میں اس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور، اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے، اڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس پارہ زر کو دل کے کسی گوشے میں چھپالوں جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

گجن پورا بھی پانچ میل سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ بیہڑ بے برگ وبار۔ گھوڑے کو روکنا پڑا۔ تیزی میں جان کو خطرہ تھا۔ آہستہ آہستہ سنبھلتا جاتا تھا کہ آسمان پر ابر گھر آیا۔ کچھ کچھ تو پہلے ہی سے چھایا ہوا تھا۔ پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افق مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ابر کی اس نئی تہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکایک سامنے ایک کف دست میدان آ گیا۔ جس کے پرلے سرے پر گجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آ رہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے، جو مجھے ہر آفت، ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بار بار ہنہنا تا تھا، اور اڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے۔ لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑا اڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں گا کہ ایک رپٹ آ پڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے اب بھی بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا میں ڈر رہا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی۔ کیوں کہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلا کر کہا، بڈھے اور داہنے کو ہو جا۔''

بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں طرف ہو لیا اور پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اسی وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ مس۔ ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آ گیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس و پیش کا موقع نہ تھا میں فوراً گھوڑے سے کودا۔ اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں کود پڑا۔ ہاتھی ڈباو پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد کھودی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکے دار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنا دی مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڈھے میں گرا تھا۔ میں ایک غوطہ کھا گیا لیکن تیر نا جانتا تھا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔ جسم بے جان ہو رہا تھا۔ میں اسے لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا دیکھا تو گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔ اس نیم جاں لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر کبھی شانے پر کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اٹھتا تھا لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں تو شاید خیال ہو میں خواہ مخواہ تعلّی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اس اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص

کر ایسی حالت میں جب کہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لحظہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے مگر میں خوش تھا کیوں کہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمار داری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی۔ رومال سے ساز کو صاف کیا اور گنجن پور چلا۔ بے خوف، بے خطر دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔

اسی وقت اندھے نے پوچھا، ''تم کون ہو بھائی، مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے کہا، ''تمہارا خادم ہوں۔''

''تمہارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔''

''وہ کون دیوی ہے؟''

''وہ دیوی پیچھے کے گاؤں میں رہتی ہے۔''

''تو کیا وہ عورت ہے؟''

''نہیں میرے لیے تو وہ دیوی ہے۔''

2.4 مزید مطالعہ کے لئے کتب:

پریم چند ایک مطالعہ (مرتبہ)	سید جلیل الدین
پریم چند کے نمائندہ افسانے	ڈاکٹر قمر رئیس
پریم چند کہانی کا رہنما	ڈاکٹر جعفر رضا
پریم چند حیات نو	مانک ٹالا

اکائی 3۔ مرید پور کا پیر

پطرس بخاری

اکائی کے اجزاء

3.1 مصنف کا تعارف

3.2 متن ''مرید پور کا پیر''

3.3 خلاصہ ''مرید پور کا پیر''

3.1 مصنف کا تعارف

پطرس کا اصلی نام سید احمد شاہ بخاری تھا۔ پطرس ان کا قلمی نام ہے۔ والد کا نام سید اسد اللہ شاہ بخاری تھا۔ پطرس یکم اکتوبر 1898ء میں پیشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ 1919ء میں گورنمنٹ کالج کے میگزین ''دراوی'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس دوران سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنے استاد Peter waticks کے قلمی نام سے مضامین لکھتے رہے۔ 26-1925ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں انگریزی ادب میں Tripos کی سند اول درجہ میں حاصل کی اور عمانویل کالج کے سینئر اسکالر منتخب ہوئے۔ 1922ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد ٹریننگ کالج میں انگریزی ادب کے استاد مقرر ہوئے اور 1960ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ جون 1952ء میں اقوام متحدہ کے مستقل نمائندے کے طور پر آپ کا تقرر ہوا۔ اس عہدہ پر وہ دو سال تک کام کرتے رہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں جب امریکہ و کینڈا کے دورے پر گئے تو ان کی بیشتر تقریریں پطرس نے ہی تحریر کیں جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

پطرس ادب کے ساتھ فنونِ لطیفہ سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے جن میں موسیقی اور مصوری سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ ادب کے میدان میں بھی انھوں نے کئی صنف میں طبع آزمائی کی۔ افسانے لکھے، تراجم کیے اور

اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ انھوں نے ماہرِ تعلیم ونشریات کے طور پر بھی نام پیدا کیا۔ پطرس نے 10 / دسمبر 1985ء میں نیویارک میں وفات پائی وہیں انھیں سپردِ خاک کردیا گیا۔

پطرس کو انگریزی ادب پر پورا عبور حاصل تھا، اسی لیے وہ اردو کی طرح انگریزی کے بھی بلند پایہ انشاء پرداز تھے۔ وہ بلا کے ذہین اور حاضر دماغ تھے۔ دوستوں سے باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ محفل میں دلچسپ اور پُرلطف باتوں سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کی برجستہ گوئی کے بیسیوں لطیفے مشہور ہیں۔

ابتدا میں ان کی تخلیقات مخزن، نیرنگ خیال اور لاہور کے دوسرے رسالوں اور جریدوں میں چھپا کرتی تھیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''پطرس کے مضامین'' 1928ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ کو عوام وخواص میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

پطرس سے قبل اردو ادب میں جس طنز ومزاح کا رواج تھا وہ الفاظ کے برمحل استعمال یا ان کی الٹ پھیر سے یا صرف پھبتی، فقرہ بازی یا شیخی خوروں اور مضحکہ خیز کرداروں کی الٹی سیدھی حرکتوں یا حماقتوں پر مشتمل تھا، جس نے مزاحیہ ادب کا جھکاؤ سنجیدہ مزاح سے کہیں زیادہ پھکڑ پن کی جانب موڑ دیا۔ اس میں معاشرے کے مروجہ مذاق کا بھی بڑا دخل تھا لیکن پطرس نے اپنے مزاح کی اساس زندہ دلی، شوخی، خوش طبعی اور لطیف مزاح پر رکھی۔ انھوں نے کسی دوسرے شخص کو نشانہ ہدف نہیں بنایا بلکہ وہ خود اپنے آپ پر بیتے ہوئے تجربات اور حادثات کو اس سادگی اور پُرکاری سے بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کی سادگی پر لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔ ان کے موضوعات میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے لیکن ان کی ذہانت نے معمولی بات کو غیر معمولی ڈھنگ سے پیش کر کے مزاح کی چاشنی میں ڈبو دیا ہے۔ ان کے اسلوب پر تصنّع کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ان کا اندازِ بیان اس قدر بے ساختہ اور فطری ہوتا ہے کہ قاری خود اپنے آپ کو اس میں شریک پاتا ہے۔ پطرس نے اپنے مزاح کو تنقید یا اصلاح کے جذبے سے بوجھل نہیں ہونے دیا لیکن اس کے باوجود قدم قدم پر ان کے چبھتے ہوئے فقرے دعوتِ فکر کے لیے ذہن کو اُکساتے ہیں۔ اسی وصف نے انھیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت عطا کردی ہے۔ 1928ء میں پطرس کے مضامین جب پہلی بار شائع ہوئے تو انھیں قابلِ رشک مقبولیت حاصل ہوئی اور اس وقت کے تمام مزاح نگاروں نے انھیں اپنا پیش امام تسلیم کرلیا بقول رشید احمد صدیقی کہ ''پطرس کا ہمسر ان کے ہمعصروں میں کوئی نہیں ہے''۔ اس طرح پطرس نے اپنی

پہلی ہی جست میں بلندیوں کو چھولیا تھا۔لیکن افسوس کہ انھوں نے بہت کم لکھا، پر جو بھی لکھا وہ قابلِ تعریف ہے۔

پطرس بخاری انگریزی داں اور نثر نگار ہیں۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا: ''پطرس نے مغربی ادب سے اثرات تو قبول کیے ہیں لیکن ان کے موضوعات میں ہر جگہ مقامی رنگ بکھرا ہوا ہے اور کہیں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ پطرس نے مغربی ادب سے خوشہ چینی کی ہے''۔

اردو نثر میں پطرس بخاری اپنی انوکھی مزاح نگاری سے پہچانے جاتے ہیں۔انھوں نے اردو مزاح نگاروں میں نیا انداز اور نیا اسلوب اختیار کیا جو اس سے بیشتر اردو میں نظر نہیں آتا۔انھوں نے اردو مزاح نگاری کو انگریزی مزاح نگاری کا انداز عطا کیا۔ پطرس واقعات، کردار اور موازنہ و مبالغہ اور اسٹائل جو مزاح کے حربے مانے گئے ہیں ان سے خوب کام لینا جانتے ہیں۔ وہ کبھی تو مزاحیہ انداز میں واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو کبھی دلچسپ اور مضحکہ خیز کردار کی حیثیت سے خود کو قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔کبھی موازنہ میں ایسی ایسی مبالغہ آرائی کرتے ہیں کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ مثلاً رات میں کُتے کے بھونکنے کو مشاعروں میں داد دینے کا عمل کہتے ہیں، لہٰذا پطرس کا اسلوب شگفتہ، دلچسپ اور نکھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے مخصوص اسلوب کی مدد سے مزاح کا لطف دوگنا کر دیتے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں: ''پطرس معمولی واقعات میں مزاح کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں اور انھیں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ تہذیبی مسائل، سیاسی مباحث اور اقدار کے چکر میں نہیں پڑتے۔ وقتِ خوش گزرے ان کا مسلک ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں''۔لہٰذا پطرس ظاہری کوائف کو دلکش اور شگفتہ انداز میں پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ان کے مشہور مضامین میں کتے، لاہور کا جغرافیہ، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی، سنیما کا عاشق، ہوسٹل میں پڑھنا، میں ایک میاں ہوں اور مرید پور کا پیر جیسے کامیاب انشائیے شامل ہیں۔ان میں ظرافت کی چاشنی زیادہ ہے، طنز بہت کم ہے۔انھیں واقعات سے مزاح پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے، جس میں ہنسی کا عنصر زیادہ ہوتا ہے لیکن معنی خیزی اور فکر انگیزی کا فقدان پایا جاتا ہے۔ پطرس کے یہاں صنف انشائیہ کے لیے جو فضا مخصوص ہے وہ کم نظر آتی ہے، اس لیے پطرس انشائیہ نگار سے زیادہ مزاح نگار لگتے ہیں۔انھیں ظرافت پیدا کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ وہ اسلوب و بیان سے بھی ظرافت پیدا کرتے ہیں اور بعض دفعہ مکالموں کے ذریعہ بیان میں ایک خاص لطف اور ڈرامائی کیفیت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

پطرس کا اسلوب سادہ فطری، رواں اور شگفتہ ہے۔ وہ مصنوعی عبارت آرائی اور فقرہ بازی سے پرہیز کرتے ہیں۔ نصاب میں شامل ان کے انشائیے ''مرید پور کا پیر'' میں انھوں نے خود اپنے تجربات و واقعات کے بیان میں مزاح کی چاشنی سے لطف پیدا کر دیا ہے اور اپنے آپ کو مزاحیہ کردار بنا کر پیش کیا ہے۔

3.2 متن۔ ''مرید پور کا پیر''

اکثر لوگوں کو اس بات کا تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات کو ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے وہاں کہیں ملازم تھا، غبن کا الزام لگا، ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر میں نہیں گھسنے دیتے۔ غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے۔ اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آجاتا ہے۔ میں شائستہ سے شائستہ دوزمانوں کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا، کہ ان پر پنچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں، میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ اعلان کر چکا ہوں، اور اب میں بانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض

لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکینِ نخوت کے لیے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرالیا لیکن یہ محض حاسدوں کی بدطینتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ دوایک مرتبہ بعض تھیٹروں کو بھی دعوت دی ہے لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اس موضوع پر کچھ نہ کہوں گا۔

جب کانگریس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا متقی ہوگا جو وہاں جانے سے گریز کرے، زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا چنانچہ میں نے مشغلہ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آ کر اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بیحد ادب و احترام کے ساتھ کھولتے، بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے پھر مقامی اخبار کے بیحد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے جو اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام "مرید پور گزٹ" ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں، دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔ رنگ گندمی، گفتگو فلسفیانہ، شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر ایک کانگریس نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت، انشاء پردازی، صحیح الدماغی اور جوش قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھ کو مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بیخبر تھا۔ سچ ہے خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ

میں نیا پنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے۔ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں میں سے گزر جاتا ہے مرید پور میں پوُ جا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگریس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے بھی بر سبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی بہر حال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز، ایک کرسی اور گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نو جوانان ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ دمہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کیلیے بیتاب ہیں۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی از حد ضرورت ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ "خار وطن از سنبل وریحان خوشتر۔۔۔" اسی طرح کی تین چار براہین قطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیا تو رفتہ رفتہ باشندگان مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک کمزور انسان ہوں اور پھر لیڈری کا نشہ ایک لمحے ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس لمحے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہل وطن کی بیچسی پر بڑا ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا کہ ان بیچاروں کی بہبود اور رہنمائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزار ہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ اُٹھ کہ سینکڑوں لوگ تیرے لیے ماحضر لئے بیٹھے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی، کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا، اسٹیشن پر کوئی شخص نہ آئے۔ ہر ایک شخص کو چاہئے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا، طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح وشام پھرتے رہے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"

"ہندو مسلم شیر وشکر ہیں۔"

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو! ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔"

"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا، وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنہوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا" والا واقعہ پڑھا تھا۔ اسے نکال کر نئے سرے سے پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا، کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی، جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑو۔ وہ توڑ نہیں سکے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کرتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا، تقریر کا آغاز سوچا۔ سو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی کہ:

"پیارے ہم وطنو!"

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے

فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے

نحوست پس وپیش منڈلا رہی ہے

یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم

ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایہ ناز شاعر یعنی الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلمبند کئے تھے۔

اس کو کیا معلوم تھا، کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا، اس کے المناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا، افلاس، غربت، بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا اور پھر پوچھوں گا، کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا، جو لوگ اکثر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت، آب وہوا، مغربی تہذیب۔ لیکن ان سب کو باری باری غلط قرار دوں گا، اور پھر اصل وجہ بتاؤں گا کہ اصل وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے، آخر میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا کہ:

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

دس بارہ دن اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنایا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نوٹ کیا، تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا،

(۱) تمہید اشعار حالی۔ (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو۔)

۲) ہندوستان کی موجودہ حالت۔

(الف) افلاس

(ب) بغض

(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی

۳) اس کی وجہ۔

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں۔

کیا آب وہوا ہے؟ نہیں۔

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں۔

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ، جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو۔)

(۴) پھر بتاؤ، کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ (نعروں کے لیے وقفہ۔)

اس کا نقشہ کھینچو۔فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔

(اس کے بعد شاید پھر چند نعرے بلند ہوں، ان کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ۔)

(۵) خاتمہ۔ عام نصائح۔خصوصیات اتحاد کی تلقین، شعر

(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو۔)

اس خاکے کے تیار کر چکنے کے بعد جلسے کے دن تک ہر روز اس پر نظر ڈالتا رہا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔نمبر۳ کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تا کہ تقریر کے دوران میں آواز سب تک پہنچ سکے اور سب اطمینان کے ساتھ ایک ایک لفظ سن سکیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔رستے میں سانگا کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان وہاں استقبال کو آئے ہوئے تھے۔انہوں نے ہار پہنائے۔اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سانگا سے مرید پور تک ان کے ساتھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرتا رہا۔جب گاڑی مرید پور پہنچی تو اسٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا۔جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔میرے ساتھ جو والنٹیئر تھے،انہوں نے کہا،"سر باہر نکالئے،لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔"میں نے حکم کی تعمیل کی۔ہار میرے گلے میں تھے۔ایک سنگترہ میرے ہاتھ میں تھا، مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔بمشکل تمام باہر نکلا۔موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا۔اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف پایا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے،تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگاتا رہا تھا۔ دائیں بائیں، سرخ سرخ جھنڈیوں پر مجھ خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔"مثلاً ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے۔""مرید پور کے فرزند خوش آمدید۔""ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔"

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا صدر جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھے سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا

اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:

"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا ہے۔۔۔"

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو، ابھی اور کئی جیبیں ہیں گھبراؤ نہیں رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔لیکن کاغذ کہیں نہ ملا۔تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا، دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا، ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔دس بارہ دفعہ جیبوں کو ٹٹولا۔لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا.جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کردوں۔بیبسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا،صدر جلسہ اپنی تقریر برابر کررہے تھے۔

مرید پور کا شہران پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کی ذات نوع انسان کے لیے۔۔۔"

خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔اس سے پہلے یہ بتانا ہے، کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا، جاہل کہنا چاہیئے، یہ ٹھیک نہیں، غیر مہذب۔

"ان کی اعلیٰ سیاست دانی، ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں،لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے۔۔۔"

ہاں وہ تقریر کاہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں،لیکن وہ تو آخر میں ہیں، وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، کہ آپ کے دل ہلا دیں گے،اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے۔۔۔"

صدر جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہورہی تھی اتنے میں صدر نے مجھ سے کچھ کہا مجھے الفاظ بالکل سنائی نہ دیئے۔اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔چنانچہ ایک چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا۔کچھ لڑکھڑایا، پھر سنبھل گیا۔میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ہال میں شور تھا، میں بیہوشی سے ذرا ہی دور تھا۔اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھی

جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خودغرضی بھی بیان کرنی ہے۔اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی بگلے اور لومڑی کی کہانی۔نہیں ٹھیک ہے دو بیل۔۔۔"

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لیے میز کو پکڑ لیا میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا، وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا، جیسے میز بھاگنے کو ہے۔اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی، گلا خشک تھا، بصد مشکل میں نے یہ کہا۔

"پیارے ہم وطنو!"

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ایک دو شخص ہنس دیئے۔میں نے گلے کو صاف کیا تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔پھیپھڑوں پر یک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی، اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ہنسی تھمی، تو میں نے کہا۔

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد ذرا دم لیا، اور پھر کہا، کہ:

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ نہ آیا، کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔سینکڑوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں، لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں بھنا گیا۔اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ارادہ کیا، کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا، ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں، تو پھر کوئی مشکل نہیں رہے گی۔

"پیارے ہم وطنوں! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب یعنی ایسی ہے، کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں۔۔۔سمجھے آپ؟ (وقفہ۔۔۔) نقص ہیں۔لیکن یہ بات یعنی امر جس کی طرف میں نیا شارہ کیا ہے گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے، سمجھ میں نہ آتا تھا، کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی، اور راستہ کچھ

صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے، کہ ایک جگہ دو بیل اکھٹے رہتے تھے، جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے۔" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا، کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

"مثلاً آپ لکڑیوں کے ایک گٹھے کو لیجیئے لکڑیاں اکثر مہنگی ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں، اس لئے گویا لکڑیوں کا گٹھا یعنی آپ دیکھئے نا۔ کہ اگر۔" (بلند اور طویل قہقہہ)

"حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ نحوست منڈلا رہی ہے۔ (قہقہے اور شور و غوغا۔۔۔ اسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے ہیں۔)

شیخ سعدی نے کہا ہے۔ کہ:

چو از قوم یکے بیدانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے۔) خیر اس بات کو جانے دیجیئے۔ بہر حال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ کہ:

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے دل پکار میں چلاؤں ہائے گل

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا، ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا:

> "جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں، ان کی زندگیاں لوگوں کے لیے شاہراہ ہیں۔ اور ان کی حکومتیں چاردانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں۔ (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی۔) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خودغرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے، کہ زندگی کے وہ تمام شعبے۔۔۔"

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح ہمت کر کے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے اردگرد اسٹیج پر آ گریں، لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے! تم دو بیل ہو۔۔۔"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی، تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا، اور زقند

بھر کے دروازے میں باہر کا رخ کیا، ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا، ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی میں بیتحاشہ اس میں گھس گیا، ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اُس دن کے بعد آج تک نہ مرید پور نے مجھے مدعو کیا ہے۔ نہ مجھے خود وہاں جانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

3.3 خلاصہ

''مرید پور کا پیر'' یہ مضمون بھی نہایت ہی دلچسپ ہے۔مرید پور گزٹ کے ایڈیٹر کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:''رنگ گندمی، گفتگو فلسفیانہ،شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔کسی صاحب کو ان کا پتا معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں اور عنداللہ ماجور ہوں، نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔مصرع وجمل؟ مشہور میں تحریف کر کے مزاح کا عمدہ پہلو نکالا ہے۔اسی مضمون میں تحریف ہے:''خار وطن از سبیل وریحان خوشتر۔۔۔اور جملہ''اس طرح کی تین چار براہین قاطع، خار کن کی جگہ خاک اور قاطع کی جگہ جامع ہے۔مرید پور کا پیر اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ تقریر کی صلاحیت یادداشتوں کی شکل میں جیب کے اندر نہیں دماغ کے اندر ہوتی ہے۔''

''انجام بخیر'' میں پطرس نے مکالمہ کی صورت کو بحسن وخوبی انجام خیر کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کا منظر جو کھینچا ہے اسے انہی کے لفظوں میں دیکھیں:''ایک تنگ وتاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لرزہ براندام سی کرسی اور اس کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں۔زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔اس انبار میں سے جہاں تک کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں وہاں شیکسپئر ، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ وغیرہ مشاہیر ادب کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ باہر کہیں پاس ہی کتے بھونک رہے ہیں۔قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ بینڈ کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے جس کے بجانے والے دق، دمہ، کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

☆☆☆

اکائی 4۔گدڑی کالال۔نوُرخاں(خاکہ)

مولوی عبدالحق

اکائی کے اہم اجزاء

4.1 مقصد

4.2 تمہید

4.3 خاکہ نگار کا تعارف

4.4 گدڑی کالال(متن)

4.5 عمومی جائزہ

4.6 خود جانچنے کا سوال

4.1 مقصد:

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ خاکہ نگار کا تعارف کروائیں

☆ خاکہ گدڑی کالال۔نورخاں کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کریں

☆ نورخاں کی حق گوئی اور بے باکی کے بارے میں اظہار خیال کریں

☆ مجموعی طور پر خاکہ گدڑی کالال۔نورخاں کا عمومی جائزہ لیں۔

4.2 تمہید:

اس اکائی میں ہم آپ کو اردو کے ایک اہم اور ممتاز خاکہ نگار مولوی عبدالحق سے متعارف کروائیں گے۔ ان کے تحریر کردہ خاکہ گدڑی کالال۔نورخاں پیش کیا جائے گا اور مجموعی طور پر اس کا عمومی جائزہ بھی لیا جائے گا۔

آیئے! پہلے خاکہ نگار سے آپ کا تعارف کروائیں؛\

4.3 خاکہ نگار کا تعارف:

مولوی عبدالحق ۱۸۷۰ء میں ضلع میرٹھ کے ایک قصبہ ہاپڑ میں پیدا ہوئے انھوں نے اہم۔اے او کالج علی گڑھ سے فلسفہ تاریخ میں بی۔اے کیا۔تعلیم سے فارغ ہو کر تلاش معاش میں حیدرآباد آئے اور کافی عرصے تک انسپکٹر مدارس کی خدمات انجام دیتے رہے۔جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کے ناظم کی حیثیت سے بھی کام کیا۔اورنگ آباد کالج کے پرنسپل بھی رہے۔پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اس عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ دہلی منتقل ہوئے۔انھوں نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی تھی۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان چلے گئے۔وہاں بھی اردو کے فروغ کی کوشش میں لگے رہے اور تادم مرگ زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ان کا انتقال ۱۹۶۱ء میں کراچی میں ہوا۔انھیں ''بابائے اردو'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق اردو زبان کے ایک بڑے محقق، صاحب طرز ادیب اور نقاد ہونے کے علاوہ ماہر زبان تھے۔انھوں نے انگریزی لغت اور اردو کی قواعد مرتب کی۔شعرائے اردو کے کئی قدیم اور نایاب تذکروں پر مقدمے لکھے۔اس کے علاوہ دکنی اور قدیم اردو کی اہم تصانیف بھی مرتب کر کے شائع کیں۔ان کی دیگر علمی اور تحقیقی تصانیف میں 'مرحوم دہلی کالج، قدیم اردو اور اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ خطبات عبدالحق، تنقیدات عبدالحق، مقدمات عبدالحق اور مکتوبات عبدالحق ان کی مشہور کتابیں ہیں۔انھوں نے شخصی خاکے بھی لکھے ہیں۔ان کے خاکوں کا مجموعہ 'چند ہم عصر' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

مولوی صاحب کسی موضوع پر لکھیں ان کے اسلوب میں سادگی، صفائی، سلاست اور شگفتگی ہر جگہ قائم رہتی ہے۔سیدھے سادے الفاظ سے جملوں میں زور پیدا کرنا ان کا امتیازی وصف ہے۔

4.4 گدڑی کا لال۔نور خاں (متن):

لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں۔میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں، اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں،

امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسےہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہوسکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونےمس ک امرااورغریب کا کوئی فرق نہں آ ہے۔

پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی ایک شان ہے نور خاں مرحوم کنٹنجنٹ کے اول رسالے میں سپاہی سیبھرتی ہوئے۔ انگریزی افواج میں حیدر آباد کی کنٹنجنٹ خاص حیثیت اور امتیاز رکھتی تھی۔ ہر شخص اس میں بھرتی نہیں ہوسکتا تھا، بہت دیکھ بھال ہوتی تھی، بعض اوقات نسب نامے تک دیکھے جاتیتھے تب کہیں جا کر ملازمت ملتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ صرف شرفا اس میں بھرتی کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ کنٹنجنٹ والے عزت کی نظر سید یکھے جاتے تھے لیکن بعد میں یہ قید اٹھ گئی اور اس میں اور انگریزوں کی دوسری فوجوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ پہلے زمانہ میں سپاہ گری بہت معزز پیشہ سمجھا تا تھا اب اس میں اور دوسرے پیشوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ بات یہ ہے کہ اشراف کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے ہر کوئی اس کی قدر نہیں کرسکتا۔ اس لیے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ کرنل نواب افسر الملک بہادر بھی نور خاں مرحوم ہی کے رسالے کے ہیں، کنٹنجنٹ کے بہت سے لوگ اکثر تو کرنل صاحب موصوف کے توسط سے نواب، کرنیل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدیدار ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کوئی نور خاں بھی ہے؟

اول رسالے کے بعض لوگوں سیمعلوم ہوا کہ خان صاحب مرحوم فوج میں بھی بڑی آن بان سے رہے اور سچائی اور فرض شناسی میں مشہور تھے، یہ ڈرل انسٹرکٹر تھے یعنی گوروں کو جو نئے بھرتی ہو کر آتے تھے، ڈرل سکھاتے تھے۔ اس لیے اکثر گورے افسروں سے واقف تھے۔ وہ بڑے شہسوار تھے اور گھوڑے خوب پہچانتے تھے، بڑے بڑے سرکش گھوڑے جو پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے تھے انہوں نے درست کیے گھوڑے کو سدھانے اور پھیرنے میں انہیں کمال تھا۔ چونکہ بدن کے چھریرے اور ہلکے پھلکے تھے۔ گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور اکثر شرطیں جیتتے تھے۔ ان کے افسران کی مستعدی اور خوش تدبیری اور سلیقے سے بہت خوش تھے۔ لیکن کھرے پن سے وہ بعض اوقات ناراض ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کے کمانڈنگ افسر نیان سے کسی بات پر خفا ہو کر جیسا کہ انگریزوں کا

عام قاعدہ ہے انہیں ڈیم کہہ دیا۔ یہ تو گالی تھی۔ خاں صاحب کسی کی ترچھی نظر کے بھی روادار نہ تھے انہوں نے فوراً رپورٹ کردی۔ لوگوں نے چاہا کہ معاملہ رفع دفع ہوجائے اور آگے نہ بڑھے۔ مگر خاں صاحب نیا یک نہ سنی، معاملے نے طول کھینچا اور جنرل صاحب کو لکھا گیا۔ کمانڈنگ افسر کا کورٹ مارشل ہوا اور اس سے کہا گیا کہ خاں صاحب سے معافی مانگے، ہر چند اس نے بچنا چاہا مگر پیش نہ گئی اور مجبوراً اسے معافی مانگنی پڑی۔ ایسی خودداری اور نازک مزاجی پر ترقی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دفعداری سے آگے نہ بڑھے۔

اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ شریف افسر خاں صاحب کی سچائی اور دیانت داری اور جفاکشی کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردلی میں رکھتے تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے کہ جن کے سر میں خنّاس سمایا ہوا تھا۔ انہیں خاں صاحب کے یہ ڈھنگ پسند نہ تھے اور وہ ہمیشہ ان کے نقصان کے درپے رہتے تھے۔ ایسے لوگ اپنی اور اپنی قوم والوں کی خودداری کو جوہر شرافت سمجھتے تھے۔ لیکن اگر یہی جوہر کسی دیسی میں ہوتا تو اسے غرور اور گستاخی پر محمول کرتے ہیں۔ تاہم ان کے اکثر انگریز افسران ان پر بہت مہربان تھے۔ خاص کر کرنل فرن ٹین ان پر بڑی عنایت کرتے تھے اور خاں صاحب پر اس قدر اعتبار تھا کہ شاید کسی اور پر ہو۔ جب کرنل صاحب نے اپنی خدمت سے استعفیٰ دیا تو اپنا تمام مال واسباب اور سامان جو ہزار ہا روپے کا تھا خاں صاحب کے سپرد کر گئے۔ یہ امر انگریز افسروں کو بہت ناگوار ہوا۔ اس وقت کے کمانڈنگ افسر سے نہ رہا گیا اور اس نے کرنل موصوف کو لکھا کہ آپ نے ہم پر اعتماد نہ کیا اور ایک دیسی دفعدار کو اپنا تمام قیمتی سامان حوالے کر گئے۔ اگر آپ یہ سامان ہمارے سپرد کر جاتے تو اسے اچھے داموں میں فروخت کر کے قیمت آپ کے پاس بھیج دیتے۔ اگر اب بھی لکھیں تو اس کا انتظام ہوسکتا ہے۔ کرنل نے جواب دیا کہ مجھے نور خاں پر تمام انگریز افسروں سے زیادہ اعتماد ہے۔ آپ کو زحمت کرنے کی ضرور نہیں ہے۔ اس پر یہ لوگ اور برہم ہوئے۔ ایک بار کمانڈنگ افسر یہ سامان دیکھنے آیا اور کہنے لگا کہ فلاں فلاں چیز میم صاحب نے ہمارے ہاں سے منگائی تھی۔ چلتے وقت واپس کرنی بھول گئے۔ اب تم یہ سب چیزیں ہمارے بنگلے پر بھیج دو۔

خاص صاحب نے کہا میں ایک چیز بھی نہیں دوں گا۔ آپ کرنل صاحب کو لکھئے وہ اگر مجھے لکھیں گے تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ وہ اس جواب پر بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ تم ہمیں جھوٹا سمجھتے ہو؟ خاں صاحب نے کہا میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، یہ سامان میرے پاس امانت ہے اور ہمیں کسی کو اس میں سے ایک تنکا بھی دینے کا مجاز نہیں۔

غرض وہ بڑبڑاتا ہوا کھسیانا ہو کر چلا گیا۔ خاں صاحب نے ایک انگریزی محرر سے اس سامان کی ایک مکمل فہرست تیار کرائی اور کچھ تو خود خریدی اور کچھ نیلام کے ذریعہ بیچ کر ساری رقم کرنل صاحب کو بھیج دی۔

نہ معلوم یہی کرنل تھا یا دوسرا کوئی افسر، جب ملازمت سے قطع تعلق کر کے جانے لگا تو اس نے ایک سونے کی گھڑی، ایک عمدہ بندوق اور پانسو روپے نقد بطور شکرانے کے خاں صاحب کو دیے۔ خاں صاحب نے لینے سے انکار کیا اور اس کی بیوی نے بہتیرا اصرار کیا مگر انہوں نے سوائے بندوق کے دوسری کوئی چیز نہ لی اور باقی سب چیزیں واپس کر دیں۔

کرنل اسٹوارٹ بھی جو ہنگولی چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر تھے، ان پر بہت مہربان تھے، رسالے کے شریف انگریزوں سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے بعد انگریز افسر تم کو نقصان بہت پہنچائیں گے۔ وہ ان کی روش سے خوش نہ تھے اور خوش کیوں کر ہوتے خوشامد سیا نہیں چڑھتی اور غلامانہ اطاعت آتی نہیں تھی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے کہ ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا۔ گھوڑے سے اتر کر اس نے خاں صاحب سے کہا کہ گھوڑا پکڑو۔ انہوں نے کہا میں سائیس نہیں ہوں۔ اس نے ایسا جواب کاہے کو سنا تھا، بہت چیں بہ جبیں ہوا مگر کیا کرتا۔ آخر باگ درخت کی ایک شاخ سیا ٹکا کر اندر چلا گیا۔ اب نہ معلوم یہ خاں صاحب کی شرارت تھی یا اتفاق کہ باگ شاخ سے نکل گئی اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ اب جو صاحب باہر آئے تو گھوڑا ندارد، بہت جھنجھلایا، بڑی مشکل سے تلاش کر کے پکڑوایا تو جگہ جگہ سے زخمی پایا۔ اس نے کرنل صاحب سے خاں صاحب کی بہت شکایت کی۔ معلوم نہیں کرنل نے اس انگریز کو کیا جواب دیا لیکن وہ خاں صاحب سے بہت خوش ہوا اور کہا تم نے خوب کیا۔

خاں صاحب نے جب یہ رنگ دیکھا تو خیر اسی میں سمجھی کہ کسی طرح وظیفہ لے کر الگ ہو جائیں، وہ بیمار بن گئے اور اسپتال میں رجوع ہوئے۔ کرنل اسٹوارٹ نے ڈاکٹر سے کہہ کر ان کو مدد دی اور اس طرح وہ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر کی رپورٹ پر وظیفہ لے کر فوجی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ سچ ہے انسان کی برائا ں ہی اس کی تباہی کا باعث نہں ک ہوتں ں۔ بعض اوقات اس کی خوباں بھی اسے لے ڈوبتی ہں ۔

کرنل اسٹوارٹ نے بہت چاہا کہ ہومسٹر ہنکن ناظم پولیس سے سفارش کر کے انہیں ایک اچھا عہدہ دلا دیں مگر خاں صاحب نے اسے قبول نہ کیا اور کہا کہا اب میں اپنے وطن دولت آباد میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اگر

آپ صوبے دار صاحب اورنگ آباد سے سفارش فرما دیں تو بہت اچھا ہو۔ کرنل صاحب بہت اصرار کرتے رہے کہ دیکھو تمہیں پولیس میں بہت اچھی خدمت مل جائیگی انکار نہ کرو مگر یہ نہ مانے۔ آخر مجبور ہوکر نواب مقتدر جنگ بہادر صوبے دار صفدر اورنگ آباد سے سفارش کی۔ صوبے دار صاحب کی عنایت سے وہ قلعہ ؟ دولت آبادی کی جمیب کے جمعدار ہو گئے اور بہت خوش تھے۔

نواب مقتدر جنگ کے بعد نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کی صوبے داری پر آئے، وہ بھی خاں صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اسی زمانہ میں لارڈ کرزن وائسرائے دولت آباد تشریف لائے۔ خاں صاحب نے سلامی دینے کی تیاری کی، کئی توپیں ساتھ ساتھ رکھ کر سلامی دینی شروع کی۔ لارڈ کرزن گھڑی نکال کر دیکھ رہےتھے۔ جب سلامی ختم ہوئی تو نواب صاحب سے خاں صاحب کی تعریف کی۔ سلامی ایسے قاعدے اور انداز سے دی کہ ایک سکنڈ کا فرق نہ ہونے پایا۔ نواب صاحب نے اس کا تذکرہ خاں صاحب سے کیا اور کہا کہ میاں اب تمہاری خیر نہیں معلوم ہوتی۔

لارڈ کرزن جب قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے تو وہاں ستانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گئے اور جیب سے سگرٹ دان نکال کر سلگایا ہی تھا کہ یہ فوجی سلامی کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگرٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگرٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔ یہ حرکت دیکھ کر نواب بشیر نواز جنگ بہادر اور دوسرے عہدیداران کا رنگ فق ہو گیا۔ مگر موقع ایسا تھا کہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ لہو کے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔ بعد میں بہت لے دے کی، مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ خاں صاحب نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی، اس پر چون وچرا کی گنجائش نہ تھی۔

اب اسے اتفاق کہیے یا خاں صاحب کی تقدیر کہ لارڈ کرزن نے جانے کے بعد ہی فنانس کی معتمدی مسٹر واکر کا انتخاب کیا۔ ریاست کے مالیے کی حالت اس زمانے میں بہت خراب تھی۔ مسٹر واکر نے اصلاحیں شروع کیں۔ اس لپیٹ میں قلعہ ؟ دولت آباد بھی آ گیا۔ اوروں کے ساتھ خاں صاحب بھی تخفیف میں آ گئے۔

دولت آباد میں ان کی کچھ زمین تھی۔ اس میں باغ لگانا شروع کر دیا۔ مسٹر واکر دورے پر دولت آباد آئے تو ایک روز ٹہلتے ٹہلتے ان کے باغ میں آ پہنچے۔ خاں صاحب بیٹھے گھاس کھرپ رہے تھے۔ مسٹر واکر کو آتے دیکھا تو اٹھ کر سلام کیا۔ پوچھا کیا حال ہے کہنے لگے آپ کی جان و مال کو دعا دیتا ہوں، آپ کی بدولت گھاس کھودنے کی نوبت

آ گئی ہے۔مسٹر واکر نے کہا کہ یہ بہت اچھا کام ہے، دیکھوتمہارے درخت انجیروں سے کیسے لدے ہیں،ایک ایک آنے کی انجیر بیچوتو کتنی آمدنی ہوجائے گی۔ خاں صاحب گھبرائے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کمبخت انجیروں پر بھی ٹیکس لگادے،تڑ سے جواب دیا کہ آپ نے انجیرلدے ہوئے تو دیکھ لیے اور یہ نہ دیکھا کہ کتنے سڑگل جاتے ہیں، کتنے آندھی ہوا سے گر پڑتے ہیں، کتنے پرندے کھاجاتے ہیں۔اور پھر ہماری دن رات کی محنت۔مسٹر واکرمسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہوکرآئے تھے۔ڈاکٹر صاحب بلا کے مردم شناس ہیں۔تھوڑی ہی دیر میں اور چند باتوں میں آدمی ایسا پرکھ لیتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے پھر جیسا وہ آدمی کوسمجھتے ہیں ویسا ہی نکلتا ہے۔کبھی خطا ہوتے نہیں دیکھی۔ڈاکٹر صاحب ایسیقابل جوہروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔فوراًہی خاں صاحب کواپنے سایہ ؟ عاطفت میں لے لیا۔ڈاکٹر صاحب کا برتاؤان سے بہت شریفانہ اور دوستانہ تھا۔نواب بزور جنگ اس زمانے میں صوبے دار تھے،مقبرہ کا باغ ان کی نگرانی میں تھا۔ڈاکٹر صاحب نے سفارش کرکے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کرادیا۔

نواب برزور جنگ کے پاس ایک گھوڑا تھا۔وہ اسے بیچنا چاہتے تھے۔کلب میں کہیں اس کا ذکرآیا۔ڈاکٹر صاحب نے کہا مجھے گھوڑے کی ضرورت ہے اسے میں خریدلوں گا۔مگر پہلے نورخاں کودکھالوں، وہاں سے آکر ڈاکٹر صاحب نے خاں صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا کہ بھئی اس گھوڑے کودیکھ آؤ۔کوئی عیب تونہیں، خاں صاحب نے کہا آپ نے غضب کیا میرا نام لے دیا۔گھوڑے میں کوئی عیب ہواتو میں چھپاؤنگانہیں اورصوبیدارصاحب مفت میں مجھ سے ناراض ہوجائیں گے۔ڈاکٹر صاحب نے کہاتم خواہ مخواہ وہم کرتے ہو،کل جاکےضرور گھوڑا دیکھ لو۔خاں صاحب گئے۔گھوڑانسل کا تو اچھا تھامگر پانچوں شرعی عیب موجود تھے۔انہوں نے صاف صاف آکے کہہ دیااورڈاکٹر صاحب نےخریدنے سے انکار کردیا۔صوبے دارآگ بگولا ہوگئے۔دوسرے روزمقبرے میں آئے اور باغ کا رجسٹر منگایااورنورخاں کے نام پراس زور سےقلم کھینچا کہ اگرحرفوں اورلفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔ڈاکٹر صاحب کومعلوم ہواتو بہت افسوس کیامگرانہوں نیاس کی تلافی کردی،یہ سُن کرصوبے دارصاحب اور بھی جھنجھلائے۔

ڈاکٹر صاحب ترقی پاکر حیدرآباد چلے گئے۔ان کی خدمت کا دوسرا انتظام ہوگیا۔کچھ دنوں بعد ڈاکٹر

صاحب ناظم تعلیمات ہوگئے اور میں ان کی عنایت سے صدرِ مہتمم، تعلیمات ہوکراورنگ آباد آیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے مجھے نور خاں سے ملایا اوران کی سفارش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں عارضی طور پر دولت آباد میں مدرّس کر دیا تھا، میں نے عارضی طور پر اپنے دفتر میں محرر کر دیا۔ وہ مدرسی اور محرری تو کیا کرتے مگر بہت سے مدرسوں اور محرروں سے زیادہ کارآمد تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب باغ کی نگرانی میرے حوالے کی تو خاں صاحب کا الاؤنس بھی جاری ہوگیا۔

اعلیٰ حضرت واقدس بعد تخت نشینی اورنگ آباد رونق افروز ہوئے تو یہاں کی خوش آب و ہوا کو بہت پسند فرمایا اور ایک عظیم الشان باغ لگانیکا حکم دیا۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب کے سپرد ہوا اوران سے بہتر یہ کام کوئی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی مہربانی سے آخراس باغ کے عملے میں خاں صاحب کو بھی ایک اچھی سی جگہ مل گئی جو ان کی طبیعت کے مناسب تھی اور آخر دم تک وہ اسی خدمت پر رہے اور جب تک دم میں دم رہا اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت داری سے کرتے رہے۔

یوں محنت سے کام تو اور بھی کرتے لیکن خاں صاحب میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ سچائی، بات کی اور معاملے کی، ان کی سرشت میں تھی اور خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے، وہ سچ کہنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے اسی میں انہیں نقصان بھی اٹھانے پڑے مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔ مستعد ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے دن ہو، رات ہو ہر وقت کام کر نیکو تیار۔ اکثر دولت آباد سے پیدل آتے جاتے تھے۔ کسی کام کو کہیے تو ایسی خوشی سے کرتے تھے کہ کوئی اپنا کام بھی اس قدر خوشی سے نہ کرتا ہوگا۔ دوستی کے بڑے پکے اور بڑے وضعدار تھے، چونکہ ادنی اعلیٰ سب ان کی عزت کرتے تھے اس لیے ان کے غریب دوستوں سیبہت سے کام نکلتے تھے۔ ان کا گھر مہمان سرائے تھا۔ اورنگ آباد کے آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف ان کے گھر پہنچ جاتے اور وہ ان سے بہت خوش ہوتے تھے۔ بعض لوگ جو مسافر بنگلے میں آکر ٹھہر جاتے تھے ان کی دعوت بھی کر دیتے تھے، بعض اوقات ٹولیوں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ ان کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اس قدر قلیل معاش ہونے پر ان کی یہ مہمان نوازی دیکھ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی بیوی بھی ایسی نیک بخت تھی کہ دفعتاً مہمانوں کے پہنچ جانے سے کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوتی تھی بلکہ خوشی خوشی کام کرتی اور کھلاتی تھی۔ خوددار

ایسے کہ کسی سے ایک پیسے کے روادار نہ ہوتے تھے۔ڈاکٹر سراج الحسن ہر چند طرح طرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہتے تھے مگر وہ ٹال جاتے تھے۔ مجھ سے انہیں خاص انس تھا، میں کوئی چیز دیتا تھا تو کبھی انکار نہ کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی خود فرمائش کرتے تھے، مٹھاس کے بیحد شائق تھے۔ان کا قول تھا کہ اگر کسی کو کھانے کو میٹھا ملے تو نمکین کیوں کھائے۔وہ کہا کرتے تھے کہ نمکین کھانا مجبوری سے کھاتا ہوں مجھ میں اگر استطاعت ہوتو ہمیشہ مٹھاس ہی کھایا کروں اور نمکین کو ہاتھ نہ لگاؤں۔''انہیں مٹھاس کو کھاتے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔اکثر جیب میں گڑ رکھتے تھے۔ایک بار میرے ساتھ دعوت میں گئے، قسم قسم کے تکلف کے کھانے تھے۔خاں صاحب نے چھوٹتے ہی میٹھے پر ہاتھ ڈالا۔ایک صاحب جو دعوت میں شریک تھے یہ خیال کر کے کہ خاں صاحب کو دھوکا ہوا کہنے لگے کہ''حضرت یہ میٹھا ہے۔''مگر انہوں نے کچھ پروا نہ کی اور برابر کھاتے رہے، جب وہ ختم ہو گیا تو دوسرے میٹھے پر ہاتھ بڑھایا۔ان حضرت نے پھر ٹوکا کہ حضرت یہ میٹھا ہے، انھوں نےکچھ جواب نہ دیا اور اسے بھی ختم کر ڈالا۔جب کبھی وہ کسی دوست کے ہاں جاتے وہ انھیں ضرور میٹھا کھلاتے اور یہ خوش ہو کر کھاتے۔

خاص صاحب بہت زندہ دل تھے۔چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی جسے دیکھ کر خوشی ہوتی تھی، وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ان سے ملنے اور باتیں کرنے سے غم غلط ہوتا تھا۔آخر دم تک ان کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔

ڈاکٹر سراج الحسن صاحب جب کبھی اورنگ آباد آتے تو اسٹیشن سے اترتے ہی اپنا روپیہ پیسہ سب ان کے حوالے کر دیتے تھے اور سب خرچ ان ہی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔جانے سے ایک روز قبل وہ حساب لے کر بیٹھتے ،بعض وقت جب بدھ نہ ملتی تو آدھی آدھی رات تک لیے بیٹھے رہتے۔ہر چند ڈاکٹر صاحب کہتے کہ خاں صاحب یہ تم کیا کرتے ہو، جو خرچ ہوا ہوا باقی جو بچا وہ دے دو یا زیادہ خرچ ہوا ہو تو لے لو۔مگر وہ کہاں مانتے تھے، جب تک حساب ٹھیک نہ بیٹھتا انہیں اطمینان نہ ہوتا۔چلتے وقت کہتے کہ لیجیے صاحب یہ آپ کا حساب ہے اتنا خرچ ہوا اور اتنا بچا۔یا کچھ زیادہ خرچ ہو جاتا تو کہتے کہ اتنے پیسے ہمارے خرچ ہوئے یہ ہمیں دلوایئے۔کبھی ایسا ہوا کہ انہیں کچھ شبہ ہوا تو جانے کے بعد پھر حساب لے کر بیٹھتے اور خط لکھ کر بھیجتے کہ اتنے آنے آپ کے رہ گئے تھے، وہ بھیجے جاتے ہیں، یا

اتنے پیسے میرے زیادہ خرچ ہو گئے تھے، وہ بھیج دیجیے گا، ڈاکٹر صاحب ان باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے۔

وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے، اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضعدار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!

خود جانچنے کا سوال:

ذیل کے سوال کا جواب تیس (۳۰) سطروں میں لکھئے۔

سوال: مولوی عبدالحق کے خاکے ''گدڑی کا لال۔ نور خاں'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجئے۔

4.5 عمومی جائزہ:

مولوی عبدالحق اردو کے ایک نامور ادیب، بلند پایہ محقق اور نقاد ہیں انہوں نے اردو کی ایسی سرپرستی کی اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے ایسے نمایاں کارنامے انجام دیے کہ ''بابائے اردو'' کہلائے۔

مولوی عبدالحق خاکہ نگاری کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے کچھ اشخاص پر مضامین اور خاکے لکھے جو ''چند ہم عصر'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں ان کی خاکہ نگاری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے معمولی اور غیر اہم شخصیتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ''نام دیو مالی'' اور ''نور خاں'' کے ایسے دلچسپ خاکے لکھے کہ ان گمنام کو زندہ جاوید کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ نادار اور معمولی انسان میں بھی ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو اسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔

''گدڑی کالال نورخاں'' مولوی عبدالحق کی مشہور کتاب ''چند ہم عصر'' سے ماخوذ ہے۔اس خاکے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں نورخاں کے گوناگوں اوصاف جیسے حق گوئی، بے باکی، خودداری، شرافت اور ایماندار کا علم ہوتا ہے۔ساتھ ہی ان کی سچائی، ایمانداری اور نیک نفسی کے اعلیٰ نمونے بھی سامنے آتے ہیں اوران کی مہمان نوازی، سادگی اور خلوص جیسی صفات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

نورخاں ایک بے ریاانسان تھے، مصلحت، موقع شناسی، اور دوراندیشی ان کی سرشت میں تھی ہی نہیں۔ وہ بہت صاف گواور بے باک تھے، موقع محل کی نزاکت کو سمجھے بغیر جو کچھ منہ میں آتا بلا تامل کہہ دیتے تھے۔ بے شک یہ ان کی خوبی تھی مگر آج کی موقع پرست دنیا میں ایسے آدمی ''نادان'' کے سوااور کچھ نہیں کہا جاسکتا نورخاں کو اپنی اس عادت کا تاوان اکثر بھگتنا پڑا۔

اس خاکے کا اختتام ایسے دلکش انداز میں ہوتا ہے کہ نورخاں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور ہر دل ان جیسا بننے کا آرزومند ہوجاتا ہے۔خاکے کا منشا بھی یہی ہے کہ جس کا خاکہ لکھا جائے اس کی کمزورں سے بھی ہم ضرور واقف ہوجائیں۔مگران کمزوریوں کے باجود ہم اسے چاہنے لگیں۔

خودجانچنے کا سوال:

سوال: مولوی عبدالحق کے خاکے ''گدڑی کالال۔نُورخاں'' کا عمومی جائزہ لیجیے۔

4.6 خودجانچنے کا سوال اور جواب:

سوال: مولوی عبدالحق کے خاکے ''گدڑی کالال۔نُورخاں'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے:

جواب:

'بابائے اردو' مولوی عبدالحق اردو کے ایک بلند پایہ محقق، نقاد اور مصنف ہیں۔اردو خاکہ نگاری میں بھی وہ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔گدڑی کالال۔نورخاں، یہ خاکہ ان کی اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔اس میں انہوں نے ایک غریب سپاہی نورخاں کی بڑی جاذب نظر تصویر پیش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ نیکی، سچائی اور ایمانداری کسی کی میراث نہیں۔یہ خوبیاں معمولی انسانوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے بڑے لوگوں میں ہوتی ہیں۔

نورخاں ایک اصول پرست، خوددار اور فرض شناس سپاہی تھے۔فوج میں بھی وہ بڑی آن بان سے رہے۔ بڑے سے بڑے فرنگی افسر کے سامنے بھی انہوں نے اپنے وقار کو قائم و دائم رکھا۔ایک مرتبہ ان کے کمانڈنگ افسر نے انھیں 'ڈیم' کہا یہ گالی تھی تو رخاں بالکل برداشت نہ کر سکے۔انھوں نے فوراً اس کی رپورٹ کردی۔آخر اس انگریز افسر کو نورخاں سے معافی مانگنی پڑی۔

ایک مرتبہ وہ اپنے کرنل کے ہاں کھڑے تھے۔ایک انگریز افسر گھوڑے پر سوار آیا، گھوڑے سے اتر کر اس نے نورخاں سے کہا''گھوڑا پکڑو'' نورخاں نے کہا''میں سائیس نہیں ہوں'' اس جواب سے انگریز افسر تلملا کر رہ گیا اور مجبوراً لگام ایک درخت کی شاخ سے لٹکا کر اندر چلا گیا۔

اس واقعہ کے بعد نورخاں وظیفہ لے کر ملازمت سے الگ ہوگئے اور کرنل اسٹوارٹ کی سفارش پر دولت آباد کی جمعیت کے جمعدار ہوگئے۔اس زمانے میں نواب بشیر نواز جنگ اورنگ آباد کے صوبہ دار تھے۔وہ نورخاں پر بہت مہربان تھے۔ ایک مرتبہ وائسرائے لارڈ کرزن دولت آباد تشریف لائے۔نورخاں قلعہ میں تعینات تھے۔ وائسرائے قلعہ میں داخل ہوئے توپوں کی سلامی کے بعد لارڈ کرزن قلعہ کے اوپر بالا حصار پر گئے وہاں ستانے کے لئے کرسی پر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ نورخاں فوجی سلامی کر کے آگے بڑھے اور کہا کہ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگریٹ نیچے پھینک دیا اور جوتے سے رگڑ ڈالا۔نورخاں نے قاعدے کی پوری پابندی کی تھی۔چون چرا کی ذرا گنجائش نہ تھی۔سب لہو کے گھونٹ پی کر چپ رہ گئے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر سید سراج الحسن صاحب جو اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات ہو کر آئے تھے نورخاں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور نواب برزور جنگ صوبیدار سے سفارش کر کے باغ سے پانچ روپے ماہانہ الاؤنس مقرر کیا۔ان ہی صوبیدار کا واقعہ ہے وہ اپنا گھوڑا فروخت کرنا چاہتے تھے۔ڈاکٹر سراج الحسن نے نورخاں کی رائے مانگی تو نورخاں نے گھوڑے کے سارے عیب بے کم و کاست بیان کردیے جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے گھوڑا خریدنے سے انکار کردیا۔اس کی پاداش میں دوسرے ہی دن صوبیدار صاحب نے نورخاں کو نوکری سے علیحدہ کردیا۔اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب نے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔

آخری زمانے میں نورخاں کو ڈاکٹر نورالحسن کی مہربانی سے اورنگ آباد میں ہی ایک عظیم الشان باغ کے عملے میں بہت اچھی جگہ ملی جو ان کی طبیعت کے مناسب تھی۔نورخاں آخر دم تک اسی خدمت پر رہے اور اپنے کام کو بڑی محنت اور دیانت سے کرتے رہے۔نورخاں بہت نیک، شریف اور سچے انسان تھے۔دوستی کے پکے اور وضع دار تھے، مہمان نوازی میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔زندہ دل، مخلص، کھرے صاف گو انسان تھے۔سچ پوچھا جائے تو قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔

مولوی عبدالحق نے نورخاں کا خاکہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے۔کہ انسان کتنا ہی معمولی اور گمنام کیوں نہ ہو اگر

اس میں انسانیت کی اعلیٰ قدریں موجود ہیں تو وہ یقیناً کسی کاکے کا موضوع بن سکتا ہے۔

سوال: مولوی عبدالحق کے خاکے ’’گدڑی کا لال۔نورخاں‘‘ کا عمومی جائزہ لیجیے:

جواب:

مولوی عبدالحق نے اردو زبان و ادب کی عظیم خدمات انجام دی ہیں۔انھوں نے اپنی ساری زندگی اسی خدمت میں گزاری ان کی غیر معمولی خدمت کی وجہ سے انھیں ’’بابائے اردو‘‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مولوی صاحب ایک صاحب طرز ادیب، ماہر زبان عظیم محقق اور نقاد تھے ان کا شمار اردو کے اہم ترین خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے خاکوں کا مجموعہ ’چند ہم عصر‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔

مولوی صاحب کی خاکہ نگاری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے عظیم شخصیتوں کے ہی خاکے نہیں لکھے بلکہ ان کی وسیع خیالی نے ان سے دو ایسے خاکے بھی لکھوائے جو نہ تو شاعر نہ ادیب نہ مصلح قوم نہ سیاست داں ہیں بلکہ انتہائی معمولی حیثیت کے عام انسان ہیں۔ایک مالی اور دوسرا سپاہی لیکن ان کے کردار کی بعض خصوصیات سے جو غیر معمولی تھیں مولوی صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ ان تصویروں کو اوراق پر منتقل کر کے انھیں ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنادیا۔

’گدڑی کا لال۔نورخاں‘ اس خاکہ میں مولوی عبدالحق نے نورخاں کی شخصیت وسیرت کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ نورخاں کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

اس خاکہ میں نورخاں سے متعلق بہت سے دلچسپ واقعات پیش کئے گئے ہیں جن کے مطالعے سے ہمیں نورخاں کی ایسی بہت سی خوبیوں سے واقفیت ہوجاتی ہے جو بڑے بڑے لوگوں میں بھی بہت کم نظر آتی ہیں لیکن یہی خوبیاں نورخاں کی ترقی میں حائل بھی ہوتی رہیں۔ان کی نیک نفسی، حق گوئی، خودداری، شرافت، ایمانداری اور مزاج کے تیکھے پن نے زندگی بھر انھیں مصائب وآلام میں گرفتار رکھا۔مولوی عبدالحق نے اس خاکے میں جہاں نورخاں کی شخصیت وسیرت کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں وہیں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ شہرت، دولت، عہدہ کوئی چیز نہیں۔اصل معیار انسانیت ہے۔

مولوی عبدالحق نے یہ خاکہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ذاتی خوبیاں اور نیکی صرف بڑے لوگوں کا ہی اجارہ نہیں ہے۔یہ ہر طبقے کے لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔اس خاکہ کے مطالعہ سے ہمیں خاکہ نگار کے ذہنی میلان اور ان کے اسلوب کی سادگی صفائی، سلاست اور شگفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اکائی ۵۔ زیرلب (صفیہ کے خطوط اختر کے نام)

صفیہ اختر

5.1 مقصد

5.2 تمہید

5.3 صفیہ اختر۔تعارف

5.4 خطوط۔متن

۱) یکم جنوری ۱۹۵۱ء بھوپال

۲) ۳/اپریل ۱۹۵۱ء بھوپال

۳) ۶/ستمبر ۱۹۵۲ء لکھنؤ

خطوط کا خلاصہ

۱، ۲، ۳۔

معلومات کی جانچ

5.5 نمونے کے امتحانی سوالات

5.6 فرہنگ

5.1 مقصد:

اُردو ادب میں خطوط نویسی ایک مستقل صنف نثر کی حیثیت ہے۔ اردو میں خطوط نگاری بتدریج ترقی کرتے ہوئے آج ارتقائی شکل میں موجود ہے۔ غالبؔ، شبلیؔ، مولانا آزادؔ، حالیؔ، اقبالؔ، صفیہ اختر اور کئی دوسرے نامور ادیبوں کے خطوط اپنے منفرد انداز بیان کی وجہ سے مقبول ہوئے ہیں۔ خط کیا ہے اس کا جواب ہم اس طرح دے سکتے ہیں کہ وہ معلومات کیفیات، خیالات اور تصورات جو ایک شخص دوسرے کو دوری کی وجہ سے راست طور پر بیان نہیں

کرسکتا اور اپنے قلم کی مدد سے تحریر کے ذریعے ظاہر کرتا ہے اسے خط یا مکتوب کہتے ہیں۔ کہ خط و کتابت ایک دوسرے سے دور رہنے والے لوگوں کے درمیان تحریری گفتگو کا نام ہے خطوط ملاقات کی کیفیت کو پیدا نہیں کر سکتے۔ اس اکائی کے ذریعے طلباء سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ طلبا خط لکھنے کے چند اصول، طریقے، اقسام کو جانیں گے۔

5.2 تمہید:

مکتوب نگاری، مکتوب نویسی پر تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ مکتوب کے عمل نمونے اور ان کی ادبی اور فنی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے گا۔

اس اکائی کو پڑھ کر آپ مکتوب نگاری کی اہمیت سے واقف ہوں گے مکتوب کو پڑھ کر بہت سی معلومات ہم کو حاصل ہوتی ہے مکتوب نگار کی شخصیت اس کے خیالات اور جذبات سے ہم واقف ہوتے ہیں۔

یہ اکائی طلباء کو اس قابل بناتی ہے کہ مکتوب نویسی کے اسلوب اور زبان و بیان کی خوبیوں کا جائزہ لیں۔

5.3 صفیہ اختر۔ تعارف:

صفیہ اختر اُردو کے مشہور شاعر جاں نثار اختر کی شریکِ حیات ہیں۔ انہوں نے اپنے شوہر جاں نثار اختر کو جو خطوط لکھے ہیں ان خطوط کی وجہ سے ان کو اردو خطوط نگاری کی دنیا میں منفرد مقام حاصل ہے۔ صفیہ اختر نے اپنے شوہر کو جو خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط کو اکٹھا کر کے ''زیرِ لب'' اور ''حرف آشنا'' نامی دو مجموعوں میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ خطوط ان کے اپنے نجی خطوط ہیں مگر صفیہ اختر کے پر اثر قلم اور دل کو چھو لینے والی جذبات نگاری نے انفرادی اور نجی چیز کو عالمگیر بنا دیا ہے۔

صفیہ اختر کے ان خطوط میں ایک فراق زدہ، بے بس، بیمار محبت کرنے والی، سماج سے ٹکرانے والی اور اپنے شوہر کی ہمت و حوصلہ بڑھا کر سہارا دینے والی عورت کی تصویر ملتی ہے۔ کرشن چندر صفیہ اختر کے خطوط کے متعلق کہتے ہیں کہ ''صفیہ کے خطوں میں مجھے نئی ہندوستانی عورت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ عورت جو بیوی بھی ہے، رفیق بھی ہے، ساتھی بھی ہے۔ وہ عورت جو مرد کے بازوؤں کی زینت ہی نہیں بلکہ خود اس کا بازو بھی ہے۔ اس کی قوت بھی ہے، توانائی ہے۔''

5.4 ''زیرلب'' (صفیہ کے خطوط اختر کے نام)

(۱)

محبوب منزل

بھوپال

یکم جنوری ۵۱ء

اختر عزیز!

بہت سا پیار، تمہارا پچیس کا لکھا ہوا خط مجھے جمعہ کو ہی مل گیا تھا۔ مستقل مصروفیت نے جواب لکھنے کی مہلت نہ دی۔ بارے کالج کا سارا پروگرام بخیر وخوبی انجام پا گیا۔ تمہاری ''ستاروں کی صدا'' بہت مقبول ہوئی۔ اس پوری پریشانی میں میری تسکین کا سامان یہی تھا۔

تم نے ایک آدھ بات ایسی لکھی ہے جس سے میں اتفاق نہیں کر سکتی، اختر تمہاری فطرت میں تھکاوٹ کا احساس آج تک مجھے نہیں ہوا۔ تمہاری ہر صلاحیت بھرپور طریقے پر آج بھی زندہ ہے۔ تم بے پناہ محبت اور شدید نصرت کر سکتے ہو۔ میں تمہاری محبت اور نفرت دونوں سے ہمیشہ خائف رہی۔ یہ تمہاری کمزوری نہیں میری ہے اور سچ پوچھو تو یہ کمزوری بھی نہیں۔ میں بہہ جانے کی قائل نہیں رہی۔ میں نے تمہارے قدم بھی ہمیشہ زمین پر ٹکانے چاہے ہیں۔ اسے اگر تم یہ سمجھو کہ تمہیں میرے دل کی وہ محبت نہیں مل سکی جو تم چاہتے تھے تو میں یہ بات نہ مانوں گی اختر۔ تم چاہ سکتے ہو اور دیوانہ وار چاہ سکتے ہو۔ میری چاہت دیوانی ہو کر بھی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرتی۔ محبت کے اس امتزاج کے سہارے ہی ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ جہاں ہم ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور بے معنی رہ جاتے ہیں دوست۔ مجھے تو تم سے وہ ملا جو دنیا میں تمہیں سے مل سکتا تھا۔ زندگی کے عظیم الشان تجربے، سماج کی عزت، بچے، گھر، کردار، شخصیت سبھی کچھ تو میں نے تم سے پایا۔ پھر بھی تم ایسا سوچ کے دل دُکھاتے ہو کہ تم مجھے بہت کچھ نہ دے سکے۔ زندگی کے حالات اُلجھے ہوئے ہیں دوست! آؤ ایک دوسرے پر اعتماد بڑھائیں۔ تم میرے سامنے سرخرو اور سر بلند ہو کر آؤ۔ تم نے مجھے ایک انوکھی اور نویلی زندگی دی ہے جو تمہارے بغیر میں نہ پا سکتی تھی۔ ایک شاعر کی بیوی ہونا

کوئی معمولی مرتبہ نہیں اختر! میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر احساس کی یہ لطافتیں میرے حصے کی نہ ہوتیں تو یہ زندگی کتنی بے کیف ہوتی۔

اختر! تم میرے Prosaic پن سے گھبراؤ نہیں گو کہ یہ کمی مجھ میں ہے لیکن یہ غنیمت ہی ہے۔ ورنہ ہم ضرور ہی حقیقتوں سے بھٹک جاتے۔ اور حقیقتوں سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے دوست! وہ ہمارا پیچھا ضرور کرتیں، میرے دل کی گرمی، میرے سینے کا گداز، میرے ذہن کی روشنی، میری کلائی کی مضبوطی یہ سب کچھ تمہاری زندگی کے راستے میں صرف ہوں گی۔ تمہاری زندگی کے لیے یہی کچھ ہے میرے پاس اور پوری وفاداری کے ساتھ ہے یہ سب کچھ۔

تم اس احساس کو مٹا ڈالو اختر کہ آج تک تمہاری طرف سے کوئی کمی میری ساتھ رہی ہے۔ اگر تمہیں میرے لیے یا مجھے تمہارے لیے کوئی قربانی دینی پڑی ہوگی تو اس کی ذمہ داری تو ان حالات پر ہے جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں۔ آج میں تم سے دور ہوں، تنہا ہوں تو کیا تم کسی طرح بھی مجھ سے بہتر حالت میں ہو؟ کیا تم میری خاطر سختیاں نہیں جھیل رہے؟ یہ قربانیاں رائیگاں نہ جائیں گی۔

آؤ یہ نیا سال اس طرح شروع کرو کہ مجھ پر اعتماد پیدا کرو۔ اور خود پر بھی۔ تمہارا حوصلہ دگنا ہو جائے گا۔ تمہاری محبت کے لازوال سرچشمے اُبل پڑیں گے۔ تم جاگ جاؤ گے اور میرا سال!

''اسی کے نام سے جس کی محبت میری دنیا ہے۔''

پیار لو

تمہاری صفو

(۲)

بھوپال

۳؍اپریل ۵۱ء

میرے ہی اختر!

ہزاروں پیار اور بہت سی دُعائیں

تمہارا پہلی کا لکھا ہوا خط مجھے آج منگل ہی کو مل گیا۔ حسب اندیشہ تمہاری طبیعت حد سے زیادہ بدمزہ اور مکدر ملی۔ دوست! تم جانتے ہو کہ یہ دور عجیب خلفشار کا دور ہے۔ بقول شخصے، ہر چہرے پر نا آسودہ خوشیوں اور نامراد اُمنگوں کی کہانی لکھی ہوئی ہے۔ تم اس نا آسودگی کی ذاتی شکست خوردگی کیوں سمجھو؟ آج دنیا کے مسائل ہی اس طرح اُلجھے ہوئے ہیں کہ ہمیں فی الحال کوئی روشن حل قریب نہیں دکھائی دیتا اور ہم بھی اس کی دنیا کا ایک حصہ ہیں۔ ہمیں بھی غیر مطمئن اور نا آسودہ رہنا ہے۔ اور اسی طرح پوری بہادری سے جینا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا یقین ہے اور ہمارا ایمان کہ اگر ہم نے یہ Fight برقرار رکھی تو جیت ہماری ہی ہوگی۔

دوست! اپنے گردو پیش نظر کرو۔ بمبئی میں بڑی آسانی سے قریب ی تم کو ہزاروں مثالیں خود سے زیادہ نا آسودہ اور خود سے زیادہ شکست خوردہ شخصیتوں کی مل جائیں گی۔ میں تو شکر کرتی ہوں کہ ہم تو پھر بھی بہتوں سے بہتر حالت میں ہیں۔ تم برسرِ روزگار ہو۔ خدانخواستہ کسی کے دست نگر نہیں۔ تمہارے بچے آرام سے ہیں اور اچھی طرح پل رہے ہیں۔ مجھے تمہاری محبت، تمہاری سر پرستی، تمہارا اعتماد، سبھی کچھ حاصل ہے۔ اور تمہیں میری پوری ہستی، میری پوری زندگی۔ پھر ہم اپنے کو ہارے ہوئے انسانوں میں کیوں سمجھیں؟ تھک مت جاؤ ساتھی، یہ خود فریبی نہیں حقیقت ہے کہ آج نہیں تو ایک روشن سویرا بھی جھلک اُٹھے گا۔

تنہائی اور اس طرح کی بے تکی زندگی بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر ذہنی سہارے بڑے تسکین کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری محبت، میری وفاداری اور میرا خلوص تمہیں اس شکست خوردگی کے احساس سے نجات نہ دلا سکا تو میں جان لوں گی کہ ضرور مجھ میں ہی کچھ کمی ہے جسے مجھے ضرور دور کرنا چاہیے؟ آخر تم نے خود کو مجھ سے علیحدہ کیوں کیا؟ اور یوں ض طبیعت کو بدحظ کیوں کیا؟ خوش رہو، کھاؤ پیو، ہنسو اور بہت سا کام کرو اس یقین کے ساتھ کہ ایک گرم دل اور دو نازک دھڑکنیں تمہیں، پیار، عزت، فخر اور غرور سے اپنا سمجھتے ہیں۔ تم کبھی بچوں کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ انہیں تم پر کتنا ناز ہے۔ زندگی کی یہ مسرتیں ہمیں ہر مخالفت اور ہر مزاحمت سے ٹکر لینے کے قابل بنا سکتی ہیں۔

گھبرا مت جاؤ دوست! میری طرف سے یہ اعتماد پیدا کرو کہ ہر کڑی گھڑی میں میرے لیے تمہاری ہی دم سے راحت ہے اور تمہاری ہی محبت سے تسکین۔ تمہاری بے پناہ دلداریاں اور تمہارا یہ گداز میری ہر چیز سے، یہاں تک کہ میری ہستی سے بھی زیادہ ہے۔ میں اس کا بدل تمہیں صرف اتنا ہی دے سکتی ہوں کہ میں تمہاری ہوں اور

تمہاری ہر مشکل میری ہے۔ میں ہر مشکل کو راحت میں تبدیل کروں گی۔ اور ہر دشواری کو تمہارے لیے آسان بناؤں گی۔ مجھ پر بھروسہ کرو اور خود پر بھی۔ پھر یہ شکست کا احساس تم میں نہ اُبھرے گا ساتھی۔

اچھا آؤ معصوم بچوں کی طرح ہر آلودگی سے پاک ہوکر میرے سینے پر رکھ دو اختر! میں کبھی کبھی وہ محبت بھی دے سکتی ہوں جو بچے کو ماں سے ملتی ہے تاکہ وہ پروان چڑھ سکے۔ اختر آج سے تم ایسے خراب اندیشے ذہن میں نہ لانا۔ زندگی بہت قیمتی ہے اور عزیز، اور پھر تمہاری یہ زندگی، اس کی قیمت کوئی مجھ سے پوچھے، آؤ ہم ایک دوسرے سے مل کر ایک ہو جائیں۔

تمہاری صفو

(۳)

لکھنؤ

۶ ستمبر ۱۹۵۲ء

میرے معصوم اختر

ہزاروں پیار

اپنی معصومیت پر حیرت نہ کرنا میری جان۔ جذبۂ معصوم ہونا چاہیے اس کے بعد انسان شدید سے شدید معصیت کے بعد بھی معصومیت نہیں کھوتا۔ جس انداز سے تم بعض لمحوں میں مجھے پیار کرتے ہو وہ سہا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے، دوست میرے جسم میں تمہارے لیے کون سی ایسی انوکھی لذت رکھی ہے جس کے تم شیدائی بن سکو، اور آج تو میں ہڈی کے ایک ڈھانچے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ البتہ میرا پیار، میری وفا، میری قدر شناسی، اگر کچھ بھی تم کو ذہنی تشفی بخش سکتی ہے تو یقین رکھو کہ اس سے تم میرے مرتے دم تک محروم نہ رہو گے۔ آؤ تم میری تندرستی کے لیے دل سے خواہش کرو۔ میں دوبارہ زندہ ہو کر تمہاری خدمت اور آرام کا ذریعہ بننا چاہتی ہوں۔ آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ اور میں بے جان سی ہو کر تم سے چمٹ جاؤں۔ بقیہ سب کچھ بھول جاؤں۔

اسرار بھائی کے پیسے اب تک تو نہیں آئے۔ اپنے کاروبار کا رنگ لکھو۔ جی چاہتا ہے تمہارے بارے میں سب کچھ جان سکوں۔ تمہارے پاس سردیوں کے لیے جرسی نہیں ہے۔ جلد ہی بنواؤں گی۔ اور؟ پیار تو کر لو دوست۔

تمہاری اپنی صفو

5.5 نمونے کے امتحانی سوالات

۱)صفیہ اختر کے خطوط کی خصوصیت کیا ہے وہ کس کے نام لکھے گئے ہیں۔

۲)صفیہ اختر کے خطوط کی انفرادیت کیا ہے؟

۳)صفیہ اختر کی حالات زندگی تحریر کرتے ہوئے بتائے کہ مکتوب نگاری میں انہیں کیا امتیاز حاصل ہے۔

۴)صفیہ اختر کا تعارف کروایئے اور مکتوب نگاری پر روشنی ڈالیے۔

5.6 فرہنگ:

الفاظ	معنی
مصروفیت	مشغول، کام میں لگا ہوا
مہلت	فرصت
تسکین	آرام دینا، تسلی دینا، دلاسا
خائف	خوف کھانے والا، ڈرنے والا
چشم پوشی	دیکھ کر ٹال جانا، درگذر کرنا
سربلند	معزز، عالی مرتبہ ممتاز
نویلا	نیا، تازہ البیلا
نویلی	نویلا کی مونث
انوکھی	نرالی
رائیگاں	بیکار
قدر شناسی	قدردانی، جوہر شناسی، ہنر شناسی، سرپرستی، عزت
تشفی بخش	تسلی، تسکین۔

5.7 سفارش کردہ کتابیں:

زیر لب حرف آشنا۔۔ صفیہ اختر

☆☆☆

اکائی 6۔زبان گویا

مولانا الطاف حسین حالؔی

اکائی کے اجزاء:

6.1 مقصد
6.2 تمہید
6.3 تعارف (مصنف)
مولانا الطاف حسین حالؔی
معلومات کی جانچ
6.4 متن ''زبان گویا''
6.5 متن کی تشریح
معلومات کی جانچ
خلاصہ
نمونے کے امتحانی سوالات
6.7 فرہنگ

6.1 مقصد:

پچھلی اکائی میں ہم نے اردو کے نثر نگار سر سید احمد خاں کا مشہور و مقبول مضمون رشک و حسد کے بارے میں بحث کی ہے۔اب اس اکائی کا مقصد آپ کو''زبان گویا'' اور زبان کی خرابیوں اور خوبیوں کے بارے میں بتائیں اور مضمون نگار کا تعارف کروائیں۔

6.2 تمہید:

اردو نثر کی ایک صنف ''انشائیہ'' ہے۔مولانا الطاف حسین حالؔی نہ صرف ایک بہترین شاعر تھے بلکہ ایک بہترین نثر نگار بھی تھے ان کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے ان کے مضمون ''زبان گویا'' کو تشریح کے

ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

6.3 مصنف کا تعارف:

خواجہ الطاف حسین اصل نام تھا اور حالیؔ تخلص تھا۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباء واجداد ہرات سے ہندوستان آ کر بس گئے تھے۔ ان کے والد خواجہ ایزدبخش بڑے نیک اور صوفی منش آدمی تھے۔ ۹ رسال کی عمر میں حالی کے سر سے سایہ پدری جاتا رہا۔ حالی سب سے چھوٹے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بھائی اور بہن نے ان کی پرورش کی۔ دستورِ زمانہ کے مطابق رسمی عربی، فارسی سے سلسلہ تعلیم شروع ہوا۔ قرآن حفظ کیا، ابھی تعلیم کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ صرف ۱۷ رسال کی عمر میں ان کی شادی کر دی گئی۔ وہ ابھی ازدواجی زندگی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ انہیں ابھی تعلیم کی دھن سوار تھی۔ چنانچہ ایک دن چپکے سے گھر بار چھوڑ کر علم کی تلاش میں پا پیادہ پانی پت سے نکل کر دِلّی کی راہ لی۔ ڈیڑھ سال تک دلی میں مولوی نوازش علی کے مکتب میں تعلیم حاصل کی جب بڑے بھائی کو پتہ چلا تو وہ انہیں لینے کے لئے دِلّی آئے۔ وہ چپ چاپ پانی پت چلے آئے اور ۱۸۵۵ء میں ملازمت اختیار کی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ملازمت جاتی رہی۔ اسی زمانے میں انہوں نے منطق اور فلسفہ حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں اور اپنی علمی استعداد میں اضافہ کیا۔

غدر کا ہنگامہ سرد ہونے کے بعد مولانا حالیؔ پھر ایک مرتبہ دلی پہنچے مرزا غالب سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ ان ہی دنوں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی چنانچہ ان کے لڑکوں کے اتالیق مقرر ہوئے اور جہانگیر آباد چلے آئے۔ یہاں کئی سال انہوں نے انتہائی اطمینان سے گزارے۔ شیفتہ کی صحبت میں شعر وشاعری کو جلا ملی۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد مولانا حالی لاہور چلے گئے۔ جہاں پر محکمہ تعلیمات کے تحت گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت اختیار کی ان کا کام انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں کی عبارت درست کرنا تھا۔ حالی کے لیے یہ کام بڑا سودمند ثابت ہوا۔ اس سے ان کو انگریزی ادب کی خوبیوں سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ یہاں حالی کی طبیعت پر مغربی خیالات کا کافی اثر ہوا اور انہوں نے اردو کی پستی دیکھ کر اس کی شاعری اور انشاپردازی کے نقائص کے اصلاح کیلئے کمر باندھی۔ کچھ عرصہ لاہور رہنے کے بعد وہ ناسازی طبع کی وجہ سے دلی واپس ہو گئے اور اینگلو عربک کالج میں اساد

ہو گئے۔ یہاں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی جس سے ان کے خیالات وافکار میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوااور علمی وادبی خدمات کے سلسلے میں وزیراعظم نظام حیدرآباد کی جانب سے ۷۵روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا بعد میں جب یہ وظیفہ سو روپیہ ہو گیا تو انہوں نے ملازمت ترک کردی۔ ۱۹۰۶ء میں ان کی علمی وادبی خدمات کے صلہ میں انہیں حکومت برطانیہ کی جانب سے شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔۱۹۱۴ء میں بمقام پانی پت ان کا انتقال ہوا۔

حالی نے تین اہم سوانح عمریاں لکھیں ہیں۔خود سرسید کی سوانح حیاتِ جاوید نام سے لکھی۔ غالب کی سوانح ''یادگارِ غالبؔ'' کے عنوان سے تحریر کی۔ ''حیات سعدی'' جو فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی کی سوانح عمری ہے۔ سرسید نے قوم کو بیدار کرنے کے لئے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ ''مدوجزر اسلام'' (اسلام کا عروج وزوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ بعد میں ''مسدس حالی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' جیسے طویل نظمیں لکھیں۔اردو تنقید کی تاریخ میں حالؔی کا بڑا مقام ہے۔اردو میں فن تنقید کی ابتداء حالی کے ''مقدمہ شعرو شاعری'' سے ہوتی ہے۔خواتین کے لیے ''مجالس النساء'' تحریر کی۔

معلومات کی جانچ:

۱) الطاف حسین حالی کی چند کتابوں کے نام لکھئے۔

۲) مقدمہ شعروشاعری پر روشنی ڈالیے۔

۳) حالی کا اسلوب نگارش مثالوں کے ذریعے واضح کیجئے۔

6.4 متن ''زبان گویا''

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطی شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان۔ سب بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا ہے اور تیری ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے۔کبھی تو ایک ساحر فسوں ساز ہے۔جس کے سحر کا رد۔ نہ جادو کا تار۔کبھی تو ایک افعی جاں گداز ہے۔جس کے زہر کی دارو۔ نہ کاٹے کا منتر، تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے

غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سی سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔جس کے تماشے سینکڑوں دیکھےاور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

ارے میری بنی بات کی بگاڑنے والی!اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی۔روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا۔روٹھے کو منانا۔اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں ہیں۔اور کہیں تیری بول شرب کے گھونٹ ہیں۔کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل۔کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت۔ہماری ذلت۔ہماری نیک نامی۔ہماری بدنامی، ہمارا جھوٹ، ہمارا سچ تیسی ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔تیری اس ہاں اور نہیں نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوانہیں۔مگر طاقت تیری نمونہ قدرت الٰہی ہے۔دیکھ اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو۔اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔راستی تیرا جوہر ہے۔اور آزادی تیرا زیور۔دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر۔اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔اور روح کے پیغام پر حاشیئے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمات نہایت ممتاز۔کہیں تیرا خطاب کاشف اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔علم ایک خزانہ غیبی ہے۔اور دل اس کا خزانچی۔حوصلہ اس کا قفل ہے۔اور تو اس کی کنجی دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول۔اور اس خزانے کو بے مواقع نہ اٹھا۔وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے۔اور تلقین وارشاد تیرا کام۔ناصح مشفق تیزی صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام۔خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا۔اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا۔اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھچھڑا رہ جائے گا۔کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اٹھائے۔تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے۔تو فریب بھی دے

اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کہلائے۔نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے۔تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی۔ ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان جنہوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور تیرا حکم بجا لائے۔ انہوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھتائے۔کسی نے انہیں فریبی اور مکار کہا۔کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ ان کا نام رکھا۔کسی نے ریا کار ٹھہرایا۔اور کسی نے سخن ساز۔کسی نے بے عہد بنایا۔اور کسی نے غماز۔غیبت اور بہتان۔مکر اور افترا۔طعن اور تشنیع۔گالی اور دشنام۔ پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔غرض دنیا بھر کے عیب ان میں نکلے۔اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے۔اے زبان! یاد رکھ۔ ہم تیرا کہا نا مانیں گے اور تیرے قابوں میں ہرگز نہ آئیں گے۔ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ہم جان پر کھیلیں گے۔ پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے۔

اے زبان ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہنا تا ہے اور کتا جب پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دم ہلاتا ہے۔سبحان اللہ! وہ نام کے جانور۔ اور ان کا ظاہر و باطن یکساں۔ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"۔

الٰہی! اگر ہم کو رخصت گفتار ہے۔تو زبان راست گفتار دے۔اور دل پر تجھ کو اختیار ہے۔ زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں۔ سچے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ (آمین)

6.5 متن کی تشریح (تبصرہ):

مولانا الطاف حسین حالؔی نہ صرف ایک بہترین شاعر تھے بلکہ ایک بہترین نثر نگار بھی تھے۔انہوں نے قوم و ملت کی اصلاح کے لئے بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ان کا مضمون ''زبان گویا'' ہے۔اس مضمون میں مولانا الطاف حسین حالؔی ہمارے جسم کے ایک اہم عضو زبان کی خوبیوں اور خرابیوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔وہ بڑے

دلکش انداز میں زبان کی انسانی جسم میں کیا حقیقت ہے بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہی زبان بچپن میں ہر ایک کا دل لبھاتی ہے، یہی زبان اپنی شوخی شرارت سے اپنے ہی ماں باپ کا دل دکھاتی ہے۔ جوانی میں اسی زبان کی مٹھاس اور جادو بیانی دلوں کا شکار کرتی ہے۔ اور یہی زبان ہے جس کی کڑوی باتیں دلوں کو توڑتی بھی ہے۔ یہی زبان جس کی ذراسی لغزش سے دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی زبان کی شیریں بیانی سے دشمن سے بھی دوست بن جاتے ہیں۔ اسی زبان کی حرکت سے بنے ہوئے کام بگڑ بھی جاتے ہیں اور بگڑے ہوئے کام بنتے بھی ہیں۔ اچھے اور برے نتائج کا انحصار اسی زبان پر ہے۔

حالؔی لکھتے ہیں کہ دیکھا جائے تو زبان صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے لیکن خدا نے اس کو بے پناہ طاقت اور قوت عطا کی ہے۔ یہی زبان ہے جو دردمندوں کی مسیحائی اور دل جوئی کرتی ہے۔ کبھی روتے کو ہنساتی ہے اور کبھی ہنستے مسکراتے لوگوں کو رُلاتی ہے۔

مولانا حالؔی نے اپنے اس مضمون ''زبان گویا'' میں زبان کے کارہائے نمایاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمارے سارے رنج وغم اور تکالیف کا انحصار اسی زبان کی ایک ہاں یا نہیں پر موقوف ہے۔ یہ زبان ہی ہے جو خدا اور انسان کے تمام رازوں کو ظاہر کرتی ہے اور یہی زبان ہے جو رازوں کی پردہ پوشی بھی کرتی ہے۔ روحانی پیغام پہنچانا اور علم وآگہی سے واقف کرانا بھی اسی زبان کا کارنامہ ہے اگر ہم دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اسی زبان نے ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

مولانا حالؔی نے اپنے اس مضمون میں زبان کو قدرت کا ایک عظیم عطیہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ زبان کا مقام ومرتبہ بہت ہی بلند وارفع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان کی تخلیق کا مقصد لوگوں کی فلاح و بہبود ہے۔ چنانچہ مولانا حالی اپنے اس مضمون میں زبان کی اس فرض منصبی سے غفلت نہ کرنے کی تنبیہ بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر زبان کی اس فرض منصبی سے غفلت کروگے تو اس کا یہ اعلیٰ منصب چھن جائے گا کیونکہ قوت گویائی کی معراج حق گوئی ہے۔ مولانا حالی آخر میں کہتے ہیں کہ خدا نے زبان تو جانوروں اور انسانوں دونوں کو عطا کی ہے اور حالی ان دونوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک ادنی گھوڑا اور کتا اپنے مالک اور آقا کو دیکھ کر فطری اور سچی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ظاہر اور باطن دونوں ایک ہوتا ہے۔ لیکن انسان کا ظاہر اور باطن یکساں کیوں نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ انسان

کے دل میں نہیں ہوتا ہے اور وہ زبان سے ہاں کہتا ہے۔ یہ زبان کی توہین ہے۔ چنانچہ مولانا حالی اس مضمون کے آخر میں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے خدا اگر تو نے قوتِ گویائی دی ہے تو حق گوئی اور راست بازی کی صفت بھی عطا کر۔ اے خدا اگر تجھ کو دل پر اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے اور جب تک زندہ رہیں سچے کہلائیں اور جب مر کر تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں۔ (آمین)

نمونے کے امتحانی سوالات:

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

۱) ''زبان گویا'' کا مختصر جائزہ لیجئے؟

۲) حالؔی نے منصب اعلیٰ کی کس طرح وضاحت کی ہے؟

۳) حالؔی نے زبان کی خرابیوں اور خوبیوں کا کس طرح تجزیہ پیش کیا ہے؟

۴) مضمون ''زبان گویا'' کی خصوصیات بیان کیجیے؟

۵) حالی کے مختصر حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

6.6 فرہنگ:

الفاظ	معنی
طوطی شِوا	خوش آواز
قاصد	پیام بر
ساحر	جادو
سحر	صبح
گانٹھ	جوڑ بند
حاشیے	کنارہ
منصب	مرتبہ

راست گفتار	سچ بولنے والا
کاشف	ظاہر کرنے والا
بساط	حیثیت
تہمت	الزام
ریا کار	زمانہ ساز
سخن ساز	خوش بیان
غماز	چغلی خوری

سفارش کردہ کتابیں:

---

۱) مقدمہ شعروشاعری -- الطاف حسین حالؔی

۲) حیات جاوید -- الطاف حسین حالؔی

۳) الطاف حسین حالی -- صالحہ عابد حسین

۴) تاریخ اردو ادب -- نورالحسن نقوی

۵) حالی کی سوانح نگاری حیاتِ جاوید کی روشنی میں -- ملک راشد فیصل

☆☆☆

اکائی۔7: خداپرست شہزادی

میرامن

سن اے جوانِ دانا! سلطان اس اقلیم کا بڑا بادشاہ تھا، ان کے گھر میں سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ایک روز بادشاہ نے جشن فرمایا، یہ ساتوں لڑکیاں سولہ سنگار بارہ ابھرن بال بال گج موتی پروکر بادشاہ کے حضور میں کھڑی تھیں۔سلطان کے کچھ جی میں آیا تو بیٹیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا، اگر تمہارا باپ بادشاہ نہ ہوتا، اور کسی غریب کے گھر میں تم پیدا ہوتیں تو تمہیں بادشاہ زادی اور ملکہ کون کہتا؟ خدا کا شکر کرو کہ شہزادیاں کہلاتی ہو، تمہاری یہ ساری خوبی میرے دم سے ہے۔

چھے لڑکیاں ایک زبان ہوکر بولیں کہ جہاں پناہ جو فرماتے ہیں، بجا ہے اور آپ ہی کی سلامتی سے ہماری بھلائی ہے، لیکن یہ ملکہ جہاں سب بہنوں سے چھوٹی تھیں، پر عقل وشعور میں اُس عمر میں بھی گویا سب سے بڑی تھیں، چپکی کھڑی رہیں، اس گفتگو میں بہنوں کی شریک نہ ہوئیں اس واسطے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے، بادشاہ نے نظرِ غضب سے ان کی طرف دیکھا اور کہا کیوں بی بی! تم کچھ نہ بولیں، اس کا کیا باعث ہے؟ تب ملکہ نے دونوں ہاتھ اپنے رومال سے باندھ کر عرض کی کہ اگر جان کی امان پاؤں اور تقصیر معاف ہو تو یہ لونڈی اپنے دل کی بات گزارش کرے، حکم ہوا کہ کہہ، کیا کہتی ہے؟ تب ملکہ نے کہا کہ قبلۂ عالم! آپ نے سُنا ہے کہ سچی بات کڑوی لگتی ہے، سو اس وقت میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں اور جو کچھ میری قسمت میں لکھنے والے نے لکھا ہے، اس کا مٹانے والا کوئی نہیں، کسو طرح نہیں ٹلنے کا۔

خواہ تم پانو گھسویا کہ رکھو سربسجود
بات پیشانی کی جو کچھ ہے کہ پیش آتی ہے

جس بادشاہ علی الاطلاق نے آپ کو بادشاہ بنایا، اُنھیں نے مجھے بھی بادشاہ زادی کہلوایا۔اس کی قدرت کے کارخانے میں کسی کا اختیار نہیں چلتا، آپ کی ذات ہماری ولی نعمت اور قبلہ وکعبہ ہے۔حضرت کے قدم مبارک کی خاک کو اگر سُرمہ کہو تو بجا ہے، مگر نصیب ہر ایک کے ہر ایک کے ساتھ ہیں۔بادشاہ یہ سن کر طیش میں آئے اور یہ جواب دل پر سخت گراں معلوم ہوا، بے زار ہوکر فرمایا، چھوٹا منہ بڑی بات، اب اس کی یہی سزا ہے کہ گہنا پاتا جو کچھ اس کے

ہاتھ گلے میں ہے، اتارلواورایک میانے میں چڑھا کر ایسے جنگل میں کہ جہاں نام ونشان آدمی آدم زاد کا نہ ہو، پھینک آؤ۔ دیکھیں اس کے نصیبوں میں کیا لکھا ہے۔

یہ موجب حکم بادشاہ کے اُس آدھی رات میں کہ (عین اندھیری تھی) ملکہ کو (جو جونرے بھونرے میں پلی تھیں اور سوائے اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی) بھوئی لے جا کر ایک میدان میں (کہ وہاں پرندہ پر نہ مارتا، انسان کو تو کیا ذکر ہے) چھوڑ کر چلے آئے، ملکہ کے دل پر عجب حالت گزرتی تھی کہ ایک دم میں کیا تھا اور کیا ہو گیا؟ پھر اپنے خدا کی جناب میں شکر کرتیں اور کہتیں، تو ایسا ہی بے نیاز ہے جو چاہا سو کیا، اور جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ اور جو چاہے گا جو کرے گا، جب تلک نتھنوں میں دم ہے، تجھ سے ناامید نہیں ہوتی، اسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی۔ جس وقت صبح ہونے لگی، ملکہ کی آنکھ کھل گئی، پکاریں کہ وضو کو پانی لانا، پھر ایک بارگی رات کی بات چیت یاد آ گئی کہ تو کہاں اور یہ بات کہاں؟ یہ کہہ کر اُٹھ کر تیمّم کیا اور دوگانہ شکر کا پڑھا۔ اے عزیز! ملکہ کی اس حالت کے سننے سے چھاتی پھٹتی ہے۔ اس بھولے بھالے جی سے پوچھا چاہیے کہ کیا کہتا ہوگا۔

سچ ہے جب کچھ بن نہیں آتا، تب خدا ہی یاد آتا ہے۔ نہیں تو اپنی اپنی تدبیر میں ہر ایک لقمان اور بوعلی سینا ہے۔ اب خدا کے کارخانے کا تماشا سنو۔ اسی طرح تین دن رات صاف گزر گئے کہ ملکہ کے منہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہ گئی، وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور وہ رنگ جو کندن سا دمکتا تھا ہلدی سا بن گیا۔ منہ میں پھیپھڑی بندھ گئی، آنکھیں پتھرا گئیں، مگر ایک دم اٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تلک سانس تب تلک آس۔ چوتھے روز صبح کو ایک درویش خضر کی سی صورت نورانی چہرہ روشن دل آ کر پیدا ہوا۔ ملکہ کو اس حالت میں دیکھ کر بولا اے بیٹی! اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے لیکن تیری قسمت میں یہ بھی بدا تھا۔ اب اس فقیر بوڑھے کو اپنا خادم سمجھ، اور اپنے پیدا کرنے والے کا رات دن دھیان رکھ، خدا خوب کرے گا، اور فقیر کے کچکول میں جو ٹکڑے بھیک کے موجود تھے، ملکہ کے روبرو رکھے اور پانی کی تلاش میں پھرنے لگا، دیکھے تو ایک کنواں تو ہے، پر ڈول رسی کہاں جس سے پانی بھرے؟ تھوڑے پتے درخت سے توڑ کر دونا بنایا اور اپنی سیلی کھول کر اس میں باندھ کر نکالا اور ملکہ کو کچھ کھلایا پلایا۔ بارے ٹک ہوش آیا، اس مردِ خدا نے بے کس اور بے بس جان کر بہت سی تسلی دی۔ خاطر جمع کی اور آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب غم خواری اور دل داری اس کی بے حد دیکھی، تب ان کے بھی مزاج کو استقلال ہوا۔ اس روز سے اس پیر مرد نے یہ مقرر کیا کہ صبح کو بھیک مانگنے کے لیے شہر میں نکل جاتا جو ٹکڑا پارچہ پاتا، ملکہ کے پاس لے آتا اور کھلاتا۔

اس طور سے تھوڑے روز گزرے۔ ایک دن ملکہ نے تیل سر میں ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جو نہیں مباف کھولا، چٹلے میں سے ایک موتی کا دانہ گول آب دار نکل پڑا۔ ملکہ نے اس درویش کو دیا اور کہا شہر میں سے اس کو بیچ لاؤ۔ وہ فقیر اس گوہر کو بیچ کر اس کی قیمت بادشاہ زادی کے پاس لے آیا۔ تب ملکہ نے حکم دیا کہ ایک مکان موافق گزران کے اس جگہ بنواؤ۔ فقیر نے کہا اے بیٹی! نیو دیوار کی کھود کر تھوڑی سی مٹی جمع کرو۔ ایک دن میں پانی لا کر گارا کر کر گھر کی بنیاد درست کر دوں گا۔ ملکہ نے اس کے کہنے سے مٹی کھودنی شروع کی۔ جب ایک گز عمیق گڑھا کھودا گیا، زمین کے نیچے سے ایک دروازہ نمودار ہوا۔ ملکہ نے اس در کو صاف کیا۔ ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمور نظر آیا۔ ملکہ نے پانچ چار لپ اشرفیوں کی لے کر پھر بند کیا، اور مٹی دے کر اوپر سے ہموار کیا۔ اتنے میں فقیر آیا، ملکہ نے فرمایا کہ راج اور معمار کاری گر اور اپنے کام کے استاد اور مزدور جلد دست بلاؤ جو اس مکان پر ایک عمارت پادشاہانہ کہ طاقِ کسریٰ کا جفت ہو، اور قصر نعمان سے سبقت لے جائے اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باؤلی اور ایک مسافر خانہ کہ لاثانی ہو، جلد تیار کریں، لیکن پہلے نقشہ اُن کا ایک کاغذ پر درست کر کے حضور میں لا دیں جو پسند کیا جائے۔

فقیر نے ایسے ہی کارکن کارکردہ ذی ہوش لا کر حاضر کئے۔ موافق فرمانے کے تعمیر عمارت کی ہونے لگی اور نوکر چاکر ہر ایک کارخانہ جات کے خاطر چن چن کر فہمیدہ اور بادیانت ملازم ہونے لگے۔ اس عمارت عالی شان کی تیاری کی خبر رفتہ رفتہ بادشاہ ظل سبحانی کو (جو قبلہ گاہ ملکہ کے تھے) پہنچی۔ سن کر بہت متعجب ہوئے اور ہر ایک سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جن نے یہ محلات بنانے شروع کئے ہیں؟ اس کیفیت سے کوئی واقف نہ تھا جو عرض کرے، سبھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ کوئی غلام نہیں جانتا کہ اس کا بانی کون ہے؟ تب بادشاہ نے ایک امیر کو بھیجا اور پیغام دیا کہ میں اُن مکانوں کے دیکھنے کو آیا چاہتا ہوں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں کی پادشاہ زادی ہو اور کس خاندان سے ہو، یہ سب کیفیت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے۔

جونہیں ملکہ نے یہ خوش خبر سنی، دل میں بہت شاد ہو کر عرض لکھی کہ جہاں پناہ سلامت! حضور کے تشریف لانے کی خبر طرف غریب خانے کی سن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی اور سبب حرمت اور عزت اس کم ترین کا ہوا۔ زہے طالع اُس مکان کے، کہ جہاں قدم مبارک کا نشان پڑے اور وہاں کے رہنے والوں پر دامنِ دولت سایہ کرے اور نظر توجہ سے دے دونوں سرفراز ہویں۔ یہ لونڈی امیدوار ہے کہ کل روز پنج شنبہ روزِ مبارک ہے اور میرے نزدیک بہتر

روز نو روز سے ہے، آپ کی ذات مشابہ آفتاب کے ہے، تشریف فرما کر اپنے نور سے اس ذرہ بے مقدار کو قدر و منزلت بخشئے۔ اور جو کچھ اس عاجزہ سے میسر ہو سکے نوش جان فرمائیے۔ یہ عین غریب نوازی اور مسافر پروری ہے۔ زیادہ حد ادب۔ اور اس عمدہ کو بھی کچھ تواضع کر کر رخصت کیا۔

بادشاہ نے عرضی پڑھی اور کہلا بھیجا کہ ہم نے تمہاری دعوت قبول کی، البتہ آویں گے۔ ملکہ نے نوکروں اور سب کاروباریوں کو حکم کیا کہ لوازمۂ ضیافت کا ایسے سلیقے سے تیار ہو کہ بادشاہ دیکھ کر اور کھا کر محظوظ ہوں۔ اور ادنیٰ اعلیٰ جو بادشاہ کی رکاب میں آویں، سب کھا پی کر خوش ہو کر جاویں۔ ملکہ کے فرمانے اور تاکید کرنے سے سب قسم کے کھانے سلونے اور میٹھے اس ذایقے کے تیار ہوئے کہ اگر باہمن کی بیٹی کھاتی تو کلمہ پڑھتی۔ جب شام ہوئی۔ بادشاہ منڈے تخت پر سوار ہو کر ملکہ کے مکان کی طرف تشریف لائے۔ ملکہ اپنی خاص خواص سہیلیوں کو لے کر استقبال کے واسطے چلیں۔ جو بادشاہ کے تخت پر نظر پڑی، اس آداب سے مجرا شاہانہ کیا کہ یہ قاعدہ دیکھ کر بادشاہ کو اور بھی حیرت نے لے لیا اور اسی انداز سے جلوہ کر کر بادشاہ کو تخت مرصع پر لا بٹھایا۔ ملکہ نے سوا لاکھ روپے کا چبوترہ تیار کروا رکھا تھا اور ایک سو ایک کشتی جواہر اور اشرفی اور پشیمنہ اور نور بانی اور ریشمی اور طلا بافی اور زردزی کی لگا رکھی تھی، اور دو زنجیر فیل اور دس راس اسپ عراقی اور یمنی مرصع کے ساز سے تیار کر رکھے تھے، نذر گزارنے اور آپ دونوں ہاتھ باندھے روبرو کھڑی رہیں۔ بادشاہ نے بہت مہربانی سے فرمایا کہ تم کس ملک کی شہزادی ہو، اور یہاں کس صورت سے آنا ہوا؟

ملکہ نے آداب بجالا کر التماس کیا کہ یہ لونڈی وہی گنہ گار ہے جو غضبِ سلطانی کے باعث اس جنگل میں پہنچی اور یہ سب تماشے خدا کے ہیں جو آپ دیکھتے ہیں، یہ سنتے ہی بادشاہ کے لہو نے جوش مارا، اُٹھ کر محبت سے گلے لگا لیا اور ہاتھ پکڑ کے اپنے تخت کے پاس کرسی بچھوا کر حکم بیٹھنے کا کیا۔ لیکن بادشاہ حیران اور متعجب بیٹھے تھے، فرمایا کہ بادشاہ بیگم کو کہو کہ بادشاہ زادیوں کو اپنے ساتھ لے کر جلد آویں، جب وے آئیں ماں بہنوں نے پہچانا اور گلے مل کر روئیں اور شکر کیا۔ ملکہ نے اپنی والدہ اور چھوں ہمشیروں کے روبرو اتنا کچھ نقد اور جواہر رکھا کہ خزانہ تمام عالم کا اس کے پاسنگ میں نہ چڑھے۔ پھر بادشاہ نے سب کو ساتھ بٹھا کر خاصہ نوشِ جان فرمایا۔

جب تلک جہاں پناہ جیتے رہے، اسی طرح گزری، کبھو کبھو آپ آتے اور کبھی ملکہ کو بھی اپنے ساتھ محلوں میں لے جاتے۔ جب بادشاہ نے رحلت فرمائی سلطنت اس اقلیم کی ملکہ کو پہنچی کہ ان کے سوا دوسرا کوئی لائق اس کام کے نہ تھا۔ ☆☆☆